بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

اغوا کی موت

اشتیاق احمد

اٹلانٹس پبلیکیشنز

www.urdukorner.com

دو باتیں

السلام علیکم!

لیجیے، پانچویں خاص نمبر کا چوتھا اور آخری حصہ حاضر ہے۔ آپ اسے اس خاص نمبر کا خاص حصہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہلے تین حصوں سے زائد صفحات کا ہے۔ میرے ایک مہربان ہیں، لطف اللہ صاحب۔ ان کا اعتراض ہے کہ میں ’دو باتیں‘ میں ناول کے نام کا لفظ پکڑ کر تکرار شروع کر دیتا ہوں یا محاورہ در محاورہ صفحہ بھر دیا جاتا ہے۔ کیا ہنسانے کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا۔ آپ کسی دل چسپ خط یا کسی اور بات کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ بات ان کی بھی ٹھیک ہے۔ چلیے میں اس مرتبہ ان کے اس دلچسپ خط کو دو باتیں کا موضوع بنا لیتا ہوں، کیونکہ شاید ان کی خواہش بھی یہی ہے۔ نہ تو اس بار ناول کا نام پکڑ کر تکرار شروع کروں گا اور نہ محاورہ در محاورہ صفحے کا پیٹ بھروں گا، ہاں کوئی بھولا بھٹکا محاورہ چلا ہی آیا تو قابلِ معافی خیال کیجیے گا کہ عادت سے مجبور بھی ہوں۔ ہاں تو لطف اللہ صاحب اپنے اس خط میں رقم طراز ہیں:

میں آپ کو اکثر لکھتا رہتا ہوں اور جوابات بھی وصول کرتا رہتا ہوں۔ آپ عصرِ حاضر کے سب سے کامیاب مصنف ہیں، اس میں ان خطوط اور انعامی سلسلوں کا بھی ہاتھ ہے۔ جو آپ نے وقتاً فوقتاً شروع کیے۔ گھاس کے موضوع پر خط جو انعامی تھا، ابنِ صفی مرحوم کے ناول ’ادھورا آدمی‘ کے پیش رس کی ہو بہو نقل ہے۔ انعام ذرا سوچ سمجھ کر دیا کریں۔ آپ نے تو ان کے ناول پڑھے ہوں گے۔ خاص نمبر میں کرداروں، خصوصاً جاسوس حضرات کی تعداد اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے، کیا آپ انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید کے خاص نمبر الگ الگ نہیں چھاپ سکتے، شاید اس طرح ناول موٹاپا اختیار نہیں کر سکتا۔ جرائم کی نوعیت ذرا زندگی کے قریب رہے تو کیا کہنا۔

ایک اور بات جس کی طرف آپ کی توجہ اکثر دلائی جاتی رہی ہے، وہ یہ کہ کچھ ناول اقساط کی صورت میں لائیں اور آخری قسط کو خاص نمبر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈائمنڈ جوبلی، پلاٹینم جوبلی بھی تو ہیں، کیا صرف خاص نمبر ہی رہ گئے ہیں۔ انسپکٹر ان کی یکسانیت سے تنگ آ کر یہ مطالبہ کیا تھا کہ آفتاب اور شوکی کے ناول لکھیں۔ ان میں اتفاقات اور سائنسی آلات کا استعمال کم اور ذہن کا کام زیادہ ہے اور بچوں کو بچہ ہی رہنے دیا گیا ہے۔

لطف اللہ صاحب کے خط کے ان الفاظ کے بعد دو باتیں پر اعتراض ہے جو پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب دیکھیے، میں نے ان کے دلچسپ خط کو دو باتیں کا موضوع تو بنا دیا، لیکن شاید آپ ایک بار بھی نہیں ہنسے ہوں گے، بلکہ مسکرائے بھی نہیں ہوں گے، مطلب یہ کہ ہنسانے کا کوئی اور طریقہ اپنایا ہی تھا کہ منہ کی کھائی۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب ذرا اس خط کا جواب بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ ایک زمانہ تھا، جب ابنِ صفی کے ناول پڑھا کرتا تھا اور یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ ادھورا آدمی تو شاید میں نے پڑھا بھی نہیں، اگر پڑھا ہو گا تو بیس سال تک کسی ناول کا پیش لفظ، لفظ بہ لفظ یاد رہ جانا کوئی آسان سی بات نہیں، لہٰذا میں کس طرح جان سکتا تھا کہ گھاس کے موضوع والا خط نقل ہے۔

اب خاص نمبروں کی بات۔ پہلا خاص نمبر جیرال کے سلسلے کا تھا۔ اس میں دونوں پارٹیاں جمع ہو گئی تھیں۔ میرے پڑھنے والوں کو یہ چیز اس قدر بھائی کہ وہ ہر خاص نمبر

میں اس چیز کے خواہشمند رہنے لگے۔ یہاں تو ہر تجویز خطوط سے نکالا جاتا ہے، کسی ایک آدمی کی رائے سے نہیں۔ مجموعی طور پر جس چیز کو پسند کیا جائے، اسی پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ باقی رہی ان کی تعداد، تو کام کے اوقات میں وہ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور بات چیت کے موقعوں پر ایک جگہ جمع۔ اس طرح بدمزگی پیدا تو نہیں ہونی چاہیے، بہرحال آئندہ اس کا بھی کوئی حل ڈھونڈ ہی لوں گا۔ جرائم کی نوعیت زندگی سے قریب ترین رکھی جائے تو پھر ہمارے ہاں تو لے دے کے زمینوں کے جھگڑوں میں قتل وغیرہ ہی رہ جاتے ہیں، یا پھر خاندانی دشمنیاں۔ جن جرائم کا ذکر آتا ہے، وہ زندگی سے الگ نہیں۔ ہمارے ہاں کم ضرور ہیں، لیکن یورپین ممالک میں یہ جرائم عام ہیں۔ خدا ہمیں محفوظ ہی رکھے۔

اقساط کی صورت میں ناول بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں، باقی جھلاہٹ محسوس کرتے ہیں، اور یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ یہ زبردستی ناول پڑھنے پر مجبور کرنے کا طریقہ ہے۔ خود میں اپنی ناول پڑھنے کی زندگی میں قسط وار ناول دیکھ کر جھنجلا اٹھتا تھا، جو چیز میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا، اب دوسروں پر کیسے ٹھونس دوں۔ سلور جوبلی وغیرہ کا لفظ ناول پر لکھ دینے سے میں نہیں سمجھتا کیا فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک مخصوص لفظ خاص نمبر میں کیا حرج ہے۔ میں دوسروں کے طریقوں پر عمل پیرا ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ شوکی سیریز پر لکھنے کے بارے میں کئی بار غور کر چکا ہوں، اس کی بھی کوشش کروں گا۔ الجھن یہ ہے کہ میرے پڑھنے والے ہر ناول میں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کے نام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ "جاسوس کہیں کا" پڑھنے کے بعد بہت سے خطوط موصول ہوئے تھے، جن میں لکھا تھا کہ "جاسوس کہیں کا، اس لیے پسند نہیں آیا کہ اس میں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ تو تھے ہی نہیں، اب لیجیے بات، اور آخر میں ان کا یہ لکھنا کہ ہنسانے کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا، تو ان کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر ہی چکا۔ آپ مہربانی فرما کر ذرا ہنس لیجیے۔ ہنسی کی بجائے اگر مجھ پر رونا آئے۔ تو مجھے لکھ دیجیے گا۔ میں پرانے طریقے کے مطابق ہی وہ باتیں کا پیٹ بھر دیا کروں گا۔ یعنی ناول کا نام پکڑا اور تکرار شروع۔ یا پھر محاوروں کی فوج چلی آ رہی ہے۔ آپ نے دیکھا، ان دو باتوں میں ایک آدھ ہی محاورہ داخل ہونے کی جرأت کر سکا۔ آپ چاہیں تو اسے بھی دھکے دے کر نکال پھینکیے۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا، لیکن کرداروں کے منہ سے جو محاورے اس حصے میں نکلنے والے ہیں، ان کا آپ کیا کریں گے۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں، خدا آپ کو ہر پریشانی سے محفوظ فرمائے۔

اشتیاق احمد

www.urdukorner.com

دوسرا سرا

آواز بند ہونے کے بعد وہ سب چند لمحے تک سکتے کے عالم میں کھڑے رہے، آخر فرزانہ کی آواز غار میں گونجی۔

''ہم بت بنے کب تک کھڑے رہیں گے، یہاں سے نکلنے کے لیے تو ہلنا جلنا ہی پڑے گا، ورنہ دشمن اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''یوں بھی ہمارے پاس الہ دین کا کوئی چراغ ہے نہ انگوٹھی کہ ہم اسے رگڑیں گے اور غار سے نکل جائیں گے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اس غار سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے سے یہ بہتر ہے کہ غار سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے جان دیں۔'' خان رحمان بولے۔

''اب سوال یہ ہے کہ یہ کوشش کہاں سے شروع کی جائے۔'' محمود کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''غار کے منہ پر رکھے ہوئے پتھر سے۔'' فرحت بولی۔

''بالکل غلط۔ ہم یہ کوشش اس سوراخ سے بھی شروع کر سکتے ہیں، جس میں سے یہ مدھم سی روشنی آ رہی ہے۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

''اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔'' انسپکٹر کامران مرزا پرجوش انداز میں بولے

کیا آپ اشتیاق احمد کی انسپکٹر جمشید سیریز کے
یہ سنسنی خیز ناول پڑھ چکے ہیں!!

ہیرو کا دشمن
گھناؤنا وار
رنگین خطرہ
تین طرف سے حملہ
پیتل کا مجسمہ
پیکٹ کی موت
(پہلا حصہ) پہاڑیوں کے جاسوس
(دوسرا حصہ) سرنگ کے نیچے
(تیسرا حصہ) بے نقاب سازش
دھوکے کا پہاڑ
طوفانی خطرہ
اندھیرے کے سوداگر
پرانے شکاری نیا جال
ہیروں کا چکر
قتل کی پیشکش
خوف کا سایہ
زہریلا ٹکراؤ
اندھا سفر

ہر ناول کی قیمت -/32 روپے

منگوانے کا پتہ
اٹلانٹس پبلیکیشنز
D-83 سائٹ، کراچی
فون: 2578273 - 2581720
e-mail: atlantis@cyber.net.pk

اور تیزی سے سوراخ کی طرف بڑھے۔

سب نے ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے انگلی کے ذریعے اس سوراخ کا جائزہ لیا اور پھر مایوسانہ لہجے میں بولے۔

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بجلی کے برمے سے سوراخ کیا گیا ہو۔ بھلا ہم اس سوراخ سے کیا کوشش شروع کر سکتے ہیں، ہم اسے اتنا بڑا کس طرح کر سکتے ہیں جس میں سے ایک آدمی گزر سکے۔"

"میرے چاقو کی مدد سے۔" محمود بول پڑا۔

"چاقو۔ کیا وہ پتھر کو کاٹ سکے گا؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"پتا نہیں۔ کوشش کر دیکھنی چاہیے۔" محمود نے کہا اور جھک کر ایڑی میں سے چاقو نکالنے لگا۔ پھر اس نے یہ انسپکٹر کامران مرزا کو دے دیا۔ انہوں نے سوراخ کے چاروں طرف دھار کو استعمال کیا، لیکن کچھ نہ بنا۔ چاقو چند ذرے بھی نہ جھاڑ سکا۔

"ناممکن۔ اس چاقو کی مدد سے ہم سوراخ کو بڑا نہیں کر سکیں گے۔" وہ بڑبڑائے۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ کیوں نہ اب ہم غار کے منہ پر رکھے پتھر کو دھکیلنے کی کوشش شروع کریں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب یہی کرنا ہوگا۔"

وہ سب غار کے منہ کی طرف چلے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ غار میں داخل ہونے کے بعد ہم نے غار کے منہ پر پتھر رکھے جانے کی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔" فرزانہ کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"شاید یہ کوئی آٹومیٹک غار ہے۔" فاروق نے منہ بنایا اور وہ مسکرائے بغیر

نہ رہ سکے۔

"بات غور طلب ہے۔ آخر آواز کیوں نہیں آئی۔" محمود کی آواز ابھری۔

"اس پر بھی غور کریں گے، پہلے پتھر پر زور لگا کر دیکھ لیں۔"

سب نے پتھر پر ہاتھ رکھ دیے، پیر پیچھے کر لیے اور لگے زور لگانے۔

"ہم نے اس طرح بسوں کو تو اکثر دھکے لگائے ہوں گے، لیکن کسی غار کے منہ پر رکھے پتھر کو دھکیلنے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ اس وقت مجھے الہ دین پر بے تحاشا ترس آ رہا ہے۔" فاروق نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔

"بے تحاشا ترس۔ لیکن کس سلسلے میں؟" آفتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی ذرا غور کرو، وہ بے چارہ بالکل اکیلا غار میں پھنس گیا تھا اور پتھر پر زور لگا رہا تھا۔ اس کی مایوسی اور گھبراہٹ کا کیا حال ہوا ہوگا، جب کہ ہم اتنے بہت سے آدمی ہیں اور غار سے نکلنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا ہے۔"

"باتیں نہ کرو، باتیں کرنے سے طاقت کم ہوگی اور ہم پورا زور نہیں لگا سکیں گے۔ سب مل کر زور لگائیں۔ میں نعرہ لگاتا ہوں، نعرے کا جواب دیتے ہی سب ایک ساتھ زور لگائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا اور پھر چند سیکنڈ رک کر زور سے بولے۔

"نعرۂ تکبیر!"

"اللہ اکبر!" سب نے کہا اور ایک ساتھ زور لگایا، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن پتھر اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں ہوا۔

وہ تقریباً دو گھنٹے تک پتھر پر ڈٹے رہے۔ آخر تھک کر پیچھے ہٹ آئے۔

کوئی غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کوئی لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ دو گھنٹے کی محنت نے انہیں نہ صرف بُری طرح تھکا دیا تھا، بلکہ بھوک بھی چمکا دی تھی۔

"ابا جان۔ کیوں نہ کچھ کھا لیا جائے۔" فاروق بولا۔

"اس کے لیے ہمیں پہلے خوراک کے ذخیرے کا جائزہ لینا ہوگا۔ غار سے نکلنا ابھی کھٹائی میں پڑا نظر آ رہا ہے۔ خوراک ہمیں اس طرح استعمال کرنا ہوگی کہ غار سے نکلنے تک ختم نہ ہو، اگر خوراک ختم ہو گئی تو پھر ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھے اور خوراک کے ڈبوں اور پانی کی بوتلوں کو ایک جگہ رکھ کر حساب لگایا۔ آخر بولے۔

"صبح شام ہمیں دو دو بسکٹ اور ایک ایک گھونٹ پانی پر گزارا کرنا ہوگا۔"

"چلیے پھر بھی شکر کا مقام ہے۔ ورنہ ہمارا دشمن ہمیں غار میں خوراک اور پانی کے بغیر بھی بند کر سکتا تھا۔" پروفیسر داؤد نے مری مری آواز میں کہا۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اس کا پروگرام یہ ہے کہ جب تک وہ ہمیں غار میں رکھنا چاہے، رکھے۔ ہم یہاں سے نکل نہ سکیں اور اس دوران کافی حد تک کمزور بھی ہو جائیں۔ اس وقت تک وہ اپنے منصوبے پر عمل کر چکا ہوگا۔ پھر وہ غار کے منہ پر سے پتھر ہٹوا دے گا اور خود غائب ہو جائے گا۔ اس طرح وہ کوئی بہت بڑی ناکامی ہمارے نام لکھ دینا چاہتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا تھکی تھکی آواز میں کہتے چلے گئے۔

"انکل! آپ کی آواز میں مایوسی کی جھلک ہے۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں میری آواز میں تھکن ہے۔ تھکن کو مایوسی کا نام نہ دو۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے انکار میں سر ہلایا۔

انہوں نے دو دو بسکٹ کھائے، ایک ایک گھونٹ پانی پیا، خدا کا شکر ادا کیا، تیمم کر کے نماز ادا کی۔ دشمنوں نے کم از کم ان کے ہاتھوں پر گھڑیاں رہنے دی تھیں اور وہ وقت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ رات کا بقیہ حصہ انہوں نے سو کر یا اونگھ کر گزارا، بیدار ہوئے تو ان کی گھڑیوں نے انہیں بتایا کہ دن شروع ہو چکا ہے، غار میں تو اب بھی اس

سوراخ سے نکلنے والی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ خود کو کافی کمزور محسوس کر رہے تھے۔ ناشتے کے طور پر انہیں پھر دو دو بسکٹ اور ایک ایک گھونٹ پانی پر گزارا کرنا پڑا۔ اور پھر سب غار کے منہ پر رکھے پتھر پر پل پڑے۔ لیکن کامیابی کی کوئی کرن نظر نہ آئی۔ ان کی مایوسی میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ خود کو مایوسی سے بچانے کے لئے اپنی تمام تر ذہنی قوت استعمال کر رہے تھے۔ خدا اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور احادیث کا سہارا لیتے رہے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کی آواز گونجی۔

"فرزانہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"جی۔ مجھے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ابا جان۔"

"تو پھر تمہاری عقل کیوں جام ہو کر رہ گئی ہے۔" وہ بولے۔

"جی میں سمجھی نہیں!" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میرا مطلب ہے، اپنی عقل سے کام لو اور غار سے باہر نکلنے کوئی ترکیب سوچو۔" انہوں نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

"اوہ۔ کیا اس غار میں بھی عقل سے کام لیا جا سکتا ہے اور کوئی ترکیب سوچی جا سکتی ہے۔" فرزانہ کے منہ سے کھوئے کھوئے انداز میں نکلا۔

"ہاں فرزانہ! عقل ایک ایسی دولت ہے۔ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اس عقل سے انسان نے وہ کام لیے ہیں کہ خود عقل میں نہیں آتے۔"

"آپ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ میری غلطی تھی۔ جو میں نے دماغ پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں اسی وقت سے اس پر زور دینا شروع کرتی ہوں۔"

"اور ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ کیونکہ کرنے کے لیے اور کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔" فرحت نے کہا۔

پھر وہ سب سوچ کے سمندر میں اتر گئے۔ سوچ کا سمندر جس کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور جس کے پھیلاؤ کا کوئی حساب نہیں تھا۔ وہ اس سمندر میں بے بس تنکوں کی مانند تھے۔ پورا دن گزر گیا، رات آئی، وہ بھی گزر گئی۔ غار میں دوسرا دن شروع ہوا۔ کمزوری میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن بھی کام نہیں کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں بھی زنگ لگ گیا ہو اور سوچ کا سمندر بھی اس زنگ کو نہ اتار پا رہا ہو۔ غار کا تیسرا دن ان کے لیے اور بھی تھکن اور مایوسی لے کر آیا۔ ایسے میں اچانک فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"آپ لوگوں کو باس کے وہ الفاظ یاد ہیں جو ہم نے غار کے اندر سنے تھے۔"

"ہاں کیوں۔ تقریباً یاد ہیں۔ ان میں ایسی کیا خاص بات تھی۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"ٹھہرو۔ فرزانہ تین دن بعد کچھ بولی ہے۔ آخر کوئی بات اس کے ذہن میں آئی ہے تو بولی ہے نا۔ ہاں فرزانہ۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے جلدی سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں، ہم سب باس کے الفاظ دوبارہ سنیں۔ ان پر غور کریں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے باس اپنے ان الفاظ کے ذریعے ہمیں کوئی غلط تاثر دینا چاہتا تھا۔"

"اوہ!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور پھر سب یاد کرنے لگے کہ باس نے کیا الفاظ کہے تھے۔

☆☆

"ابا جان! مجھے باس کے الفاظ تقریباً اسی فیصد یاد آ گئے ہیں۔" گہری

خاموشی میں فرزانہ کی آواز ابھری۔

"تو یوں کہو۔ الفاظ تم نے پہلے ہی ذہن میں محفوظ کر لیے تھے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ بات نہیں، جس وقت ہمارے دشمن کی آواز غار میں گونج رہی تھی، اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تک نہیں تھی کہ وہ ہمیں کوئی اور تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بات تو مسلسل ناکامیوں نے مجھے سمجھائی ہے۔"

فرزانہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چلو خیر یونہی سہی۔ اس کے الفاظ تھوڑے بہت ہمیں بھی یاد ہیں۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ ان پر سو فیصد کی چھاپ لگا سکیں۔ لہٰذا تم ہی بتاؤ۔" آصف نے تنگ آئے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں ضرور۔ میں اس کے الفاظ دہراتی ہوں۔ اب ان سے نتیجہ نکالنا ہم سب کا کام ہے۔ آخر وہ ہمیں کیا تاثر دینا چاہتا تھا۔" یہ کہہ کر فرزانہ چند لمحے کے لیے رکی اور پھر باس کے الفاظ اپنی یادداشت کے مطابق دہرانے لگی:

"میں تمہارا بدترین دشمن ہوں۔ تمہیں زندہ رکھ کر دشمنی کا مزا چکھانا چاہتا ہوں، تم یہاں زندہ رہو گے اور ادھر میں اپنا کام کرتا رہوں گا، چاہتا تو میں یہ تھا کہ تم لوگ شیشے کی عمارت میں قید رہو، لیکن تم وہاں سے بچ نکلے، تمہیں فوری طور پر یہاں لانے کا منصوبہ ترتیب دینا پڑا۔ یہاں ہمارے ایسے کئی ٹھکانے ہیں۔ یہ غار اور غار کے منہ پر پتھر ہمارا آزمایا ہوا ہے۔ میرا چیلنج ہے تم اسے ہٹا کر غار سے نہیں نکل سکتے۔ اگر تم نے یہ پتھر ہٹا دیا اور غار سے نکل آئے تو میں تم لوگوں کے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جاؤں گا۔ ورنہ پروگرام تو یہ ہے کہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد تمہیں اس غار سے نکال دوں اور یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اس کے بعد باقاعدہ پروگرام بنا کر تم سے دو

وہ ابھی کرتے آؤں۔ کیوں کیسا پروگرام ہے۔ تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے، کسی دشمن سے پالا پڑا تھا۔"

یہاں تک کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی۔ سب کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے۔ مدھم روشنی میں ان سب نے دیکھا کہ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں، گویا وہ دونوں بھانپ گئے تھے کہ باس انہیں کیا غلط تاثر دینا چاہتا تھا، تاہم وہ خاموش تھے، شاید وہ ان کے انداز سے سننا چاہتے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے محمود نے کہا۔

"ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ باس ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھانا چاہتا تھا کہ اس غار سے نکلنے کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ ہے، غار کا منہ جس پر اتنا بھاری پتھر رکھا ہے کہ ہم اسے ہلا بھی نہیں سکتے۔ اس ایک راستے کے علاوہ غار سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے ہی نہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" فاروق نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"تت۔ تو کیا۔ تو کیا اس غار کا کوئی دوسرا سرا بھی ہے میرا مطلب ہے دوسرا منہ بھی ہے۔"

"اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اف خدا۔ اور ہم نے تین دن اس پتھر سے سر ٹکراتے گزار دیے۔ یہ نہ سوچا کہ اس غار کا کوئی دوسرا سرا بھی ہو سکتا ہے۔ گھپ اندھیرے نے ہمیں اس سمت میں دیکھنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس غار کا کوئی دوسرا سرا ہے تو ہم اس سرے تک اندھیرے میں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ مدھم سی روشنی تو بس منہ کے آس پاس پھیلی ہوئی ہے۔" خان رحمان کہتے چلے گئے۔

"اس کے ساتھ ہی ایک اور بات۔ غار میں داخل ہونے کے بعد ہم نے اس کے منہ پر کسی پتھر کے آ گرنے کی آواز تک نہیں سنی۔ اس کا مطلب ہے غار کے منہ پر پہلے سے پتھر موجود تھا اور ہمیں دوسرے سرے سے ہی اندر لایا گیا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے نئی بات کی۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ صرف انسپکٹر جمشید خاموش رہے تھے، البتہ ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ضرور رینگ رہی تھی۔

"اب چاہے، ادھر اندھیرا ہو یا کچھ ہو۔ ہم اس طرف سے نکلنے کی کوشش ضرور کریں گے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے یہ غار کتنا لمبا ہو۔ کیوں نہ ہم خوراک کا ذخیرہ ساتھ لے چلیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مشورہ دیا۔

"یہ بھی ٹھیک رہے گا۔"

انہوں نے جلدی جلدی سارا سامان اٹھایا اور دوسری طرف بڑھے، کچھ دیر تک تو مدھم روشنی نے ان کا ساتھ دیا اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"اب ہم اندھیرے میں سفر کریں گے۔ ہم نہیں جانتے، اس غار میں آگے کیا کچھ بلائیں ہمارے استقبال کے لیے موجود ہیں۔ زہریلے کیڑے۔ کوئی گہری کھائی۔ اور نہ جانے کیا کچھ خطرات موجود ہیں۔ لیکن ہمیں آگے بڑھنا ہی ہوگا، کیونکہ آگے بڑھنے کے سوا ہمارے سامنے کوئی اور راستہ بھی تو نہیں ہے، غار کے منہ پر سے پتھر کو اگر ہم ہٹا سکتے تو پہلے دن میں ہٹا لیتے اس کے بعد سے تو ہماری طاقت میں کمی ہی ہوئی ہے۔"

"کھائی سے محفوظ رہنے کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ

لیں۔ اس طرح ہم میں سے اگر کوئی گرنے بھی لگے گا تو دوسرے اسے سنبھال لیں گے۔ باقی رہے زہریلے کیڑے تو ان سے اس غضب کے اندھیرے میں ہم کس طرح مقابلہ کریں گے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"ایسے لمحات میں ہم اپنی پنسل ٹارچیں کام میں لائیں گے۔ ہم سخت ضرورت کے وقت ہی انہیں روشن کریں گے۔ احتیاطاً میں ایک پنسل ٹارچ ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً اسے روشن کر کے راستہ دیکھتے رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ پنسل ٹارچ کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ لیکن ابا جان۔ وہ پنسل ٹارچیں کب تک کام دیں گی۔" محمود بولا۔

"دیکھا جائے گا۔" انہوں نے کہا اور ٹارچ روشن کر کے اس کی روشنی سامنے ڈالی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ یہ ایک صاف ستھرا غار تھا۔ لیکن ٹارچ کی روشنی میں اس کا دوسرا سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے دوسرا سرا کتنی دور تھا۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھانے لگے۔

☆☆☆

www.urdukorner.com

اندھیرے کا سفر

گھڑیوں کے حساب سے وہ پورا دن چلتے رہے، لیکن غار نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ اتنا ضرور تھا کہ ابھی تک ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ غار اس حد تک صاف ستھرا تھا، جیسے انسانی ہاتھوں نے بنایا ہو۔ رات کو انہوں نے آرام کرنے کی ٹھانی۔ بسکٹ اور پانی ابھی تک ان کے ساتھ دے رہے تھے۔ اگر یہ سہارا نہ ہوتا تو اس وقت ان کا نہ جانے کیا حال ہوتا، کچھ بھی ہو، ان کا دشمن انہیں جان سے واقعی نہیں مارنا چاہتا تھا۔ ورنہ اس غار میں موت انہیں ضرور آ لیتی اور وہ سب گمنام موت مر چکے ہوتے۔

دوسرے دن انہوں نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ اس رات بھی انہوں نے آرام کیا۔ ان کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ غار ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گویا انہیں غار میں پانچ دن ہو گئے تھے۔ اس خیال سے ہی انہیں ہول آنے لگا۔ پانچ دن میں تو ان کے ملک میں نہ جانے کیا ہو چکا ہوگا۔ ان کے دشمن اپنے منصوبے پر عمل کر بھی چکا ہوگا۔ لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ان حالات کا شکار تو وہ زندگی میں شاید ہی کبھی ہوئے ہوں گے۔ فاروق بھی اب تو چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔ آفتاب کی آواز کسی نے بہت دیر سے نہیں سنی تھی۔ باقی سب ہی کبھی کبھار کوئی بات کر لیتے تھے۔

ایسے میں خان رحمان کی آواز نے انہیں جھنجوڑا:

"بھئی فاروق! مجھے کم از کم تم سے ایسی امید نہیں تھی۔"

"کیسی امید انکل۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کہ ان حالات میں تم چپ ہو جاؤ گے۔ خدا کے لیے اپنی باتوں کی شمع جلائے رکھو۔ پھلجھڑیاں چھوڑتے رہو۔ ورنہ یہ سفر بہت کٹھن ہو جائے گا۔"

"بات تو خان رحمان نے ٹھیک کہی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"سوری انکل۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ خیر۔ اب آپ مجھے خاموش نہیں پائیں گے۔ ہم اس غار سے باہر نکل سکیں یا نہ نکل سکیں۔ میری باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ میں آپ کو یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ ہم ایک ایسے غار میں سفر کر رہے ہیں جس کے دوسرے سرے کی امید بھی خواب معلوم ہوتی ہے۔"

اس کی آواز میں درد تھا۔ دکھ تھا۔ وہ اس درد کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے فاروق کی شوخ آواز سنی۔

"ہیلو آفتاب۔ یار کیا تمہیں بھی سانپ سونگھ گیا ہے۔"

مصیبت تو یہی ہے، اس غار میں تو کسی سانپ سے بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ کچھ تو ایڈونچر رہتا۔"

"بھئی ہر غار میں تو سانپ نہیں ہوتے۔" منور علی خان بولے۔

"لیجیے۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ انکل منور علی خان بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے سانپ کیا کوئی شیر بھی آ نکلے تو کیا پروا ہے۔" فرزانہ چہکی۔

"مجھے تو اس غار میں کسی ایسی چیز سے ملاقات ہوتی محسوس نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے جیسے اسے انسانی ہاتھوں نے صاف کیا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باس جیسے لوگوں کے زیر استعمال رہا ہو۔" آصف نے خیال ظاہر کیا۔

"اوہو۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔" اچانک فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"خدا کا شکر ہے، اس غار میں بھی تم کچھ سن سکتی ہو۔ ذرا جلدی سے بتاؤ۔
یا سن رہی ہو۔"

"پپ پانی۔" فرزانہ ہکلائی۔

"پپ پانی۔ کیا یہ پانی کی کوئی قسم ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اور۔ یہ پانی کو کیسے سنا جاتا ہے۔" آفتاب نے بھی فوراً کہا۔

"تم دونوں نرے احمق ہو۔ پانی گرنے کی آواز بھی سنی جاتی ہے اور دریا
شور بھی۔ سمندر کی لہروں کی آواز بھی سنی جاتی ہے۔"

"تو کیا تم اس وقت اس قسم کی کوئی آواز سن رہی ہو۔" منور علی خان کی
آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"تب تو۔ تب تو ہم اس غار کے دوسرے سرے پر پہنچنے والے ہیں۔"
نہوں نے کہا۔

"اس صورت میں بھی غار کا سرا اتنا نزدیک نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید
سکرائے۔

"وہ کیسے؟" منور علی خان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فرزانہ بہت ہی خفیف آوازیں بھی سن لیتی ہے۔ اب دیکھیے نا۔ ہم میں
ے کسی کو ابھی تک پانی کے گرنے کی آواز سنائی نہیں دی۔"

"اوہ ہاں۔ یہ بات تو ہے۔"

"تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ان سبھی نے پانی کے گرنے کی آواز سن
اور ان کے قدموں میں اور تیزی آ گئی۔ یوں لگا جیسے مردہ تنوں میں جان پڑ گئی ہو۔

پورا دن وہ چلتے رہے۔ پانی کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی رہی۔ لیکن رات ہونے پر بھی غار کا دوسرا سرا نظر نہ آیا۔ تاہم آج رات انہوں نے آرام کرنے کا ارادہ ختم کر دیا۔ اب نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ اب تو وہ غار کے دوسرے سرے کو جلد از جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

''یہ دوسرا سرا تو ہمارے لیے اس دنیا کا دوسرا سرا ثابت ہو رہا ہے۔''

فاروق بڑبڑایا۔

''معلوم ہوتا ہے، ہمت ہار رہے ہو۔'' آفتاب نے فوراً کہا۔

''ہمت ہاریں میرے دشمن۔'' اس نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں ہاتھ نچایا۔ جو اتفاق سے آصف کی ناک پر لگا۔ وہ بھنا گیا اور ایک زوردار مکا فاروق کی طرف گھمایا۔ لیکن اندھیرے میں اس کا مکا محمود کے لگا۔

''اف۔ یہ کیا کیا۔'' محمود نے تلملا کر کہا۔

''ارے باپ رے۔ مکا تمہیں لگ گیا۔'' آصف بوکھلا گیا۔

''معلوم ہو گیا تم اندھیرے میں اچھا نشانہ نہیں لے سکتے۔'' فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

''لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا ہرگز نہیں۔''

''ارے تو کیا تم اس غار میں مجھ سے کشتی لڑو گے۔ وہ بھی اندھیرے میں۔ یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ کون جیتا کون ہارا۔ کس کا پلہ بھاری رہا۔'' فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے غار سے باہر نکل کر یہ مقابلہ ہو جائے۔'' محمود نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''مجھے منظور ہے۔'' آصف بولا۔

''لیکن ہمیں منظور نہیں، ہم اس وقت بہت ہی عجیب حالات کا شکار ہیں، باہر نکلنے کے بعد تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ اور اپنے شہر سے کتنی دور ہیں، کیونکہ ہم کئی دن سے غار میں سفر کر رہے ہیں، نہ جانے ہم کہاں نکلیں گے۔'' انسپکٹر کامران جھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

پانی کا شور اب ان کے کانوں کا مزاج پوچھنے لگا تھا اور باتیں کرنے کے لیے انہیں تیز آواز حلق سے نکالنا پڑ رہی تھی۔ تمام رات گزرنے پر بھی غار کا دوسرا سرا نظر نہ آیا تو اچانک شدید مایوسی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''کہیں ہم الّو تو نہیں بن رہے۔'' انسپکٹر جمشید نے قدم روکتے ہوئے کہا۔

''الّو اور اس غار میں۔'' فاروق کے منہ سے نکلا۔

''ہو سکتا ہے یہ آواز ایک دھوکا ہو۔ جس طرح اس غار میں روشنی کے لیے وہ سوراخ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح آواز کے لیے کچھ مائیک وغیرہ لگا دیے گئے ہوں اور یہ آواز مصنوعی ہو۔''

''اوہ۔!'' ان کے منہ سے نکلا۔ سب پریشان ہو گئے۔

''جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ آواز آبشار کے گرنے کی ہے اور مصنوعی نہیں ہے۔'' منور علی خان بولے۔

''آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مصنوعی نہیں ہے۔ اگر ہم ایک اصل آبشار کی آواز ٹیپ کر لیں تو وہ آواز مصنوعی ہرگز محسوس نہیں ہو گی۔''

''لیکن اتنی لمبی ٹیپ۔ آخر کبھی تو اس کا سلسلہ ٹوٹتا اور پھر شروع ہوتا۔''

''ہوں۔ آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ یہ ضرور اصل آبشار کی آواز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر غار کا دوسرا سرا اور کتنی دور ہے۔''

''میرے خیال کے مطابق تو اب زیادہ دور نہیں رہ گیا۔ اگر ہم رُکے بغیر

چلتے رہے تو شاید سات آٹھ گھنٹے بعد غار کا دوسرا سرا دیکھ لیں گے۔'' منور علی خان بولے۔

''ہم نہیں رکیں گے۔'' محمود نے پُرجوش آواز میں کہا۔ اور پھر منور علی خان کا خیال بالکل درست نکلا۔ ٹھیک سات گھنٹے بعد ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ان کے چہروں سے ٹکرانے لگے۔ ان کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی۔ وہ دوڑنے لگے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ چلنے کی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن دوسرے سرے کو دیکھنے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ وہ دوڑنے لگے۔ اور آخرکار دوسرا سرا ان کے سامنے تھا۔ ان کے اٹھتے قدم رُک گئے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ غار کے منہ کو دیکھنے لگے۔

☆☆

دن کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں غار کا منہ انہیں صاف نظر آ رہا تھا۔ غار کے منہ سے ذرا آگے پانی کی ایک بہت بڑی موٹی دھار نیچے گر رہی تھی۔ گویا آبشار غار کے منہ سے کہیں اوپر سے گر رہی تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ ٹکٹکی باندھے اس منظر کو دیکھتے رہے اور پھر دیوانوں کی طرح بھاگ پڑے۔ جیسے کئی دنوں کا بھوکا روٹیوں کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ غار کے منہ پر پہنچ کر وہ سب رُک گئے۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آبشار نے نیچے ایک بہت بڑی جھیل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ حد نگاہ تک یہ جھیل نظر آ رہی تھی۔ غار بہت اونچائی پر تھا، اس کے دائیں بائیں سیدھی چٹانیں تھیں جن پر پاؤں جمانا ناممکن تھا۔ پھر انہوں نے باری باری نیچے جھانک کر دیکھا اور کانپ کر رہ گئے۔

''یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے۔'' فاروق نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''کاش ہمارے پاس ڈوری ہوتی جس کی مدد سے ہم وادی سے میدان میں پہنچے تھے۔ اس کے ذریعے ہم نیچے اتر سکتے تھے۔'' خان رحمان نے سرد آہ بھری۔

''دیکھو بھئی۔ بات یہ ہے۔ واپس تو ہم جا نہیں سکتے۔ کیونکہ واپس جانے میں چھ سات دن لگ جائیں گے۔ اتنے دن تک خوراک ہمارا ساتھ نہیں دے گی اور پھر کسی طرح غار کے دوسرے منہ تک پہنچ بھی جائیں تو کیا فائدہ۔ پتھر ہم ہٹا نہیں سکیں گے۔ لہٰذا بچ نکلنے کا امکان اس طرف ایک فی صد بھی نہیں، جب کہ اس طرف بچ نکلنے کے امکانات پچاس فیصد سے بھی زائد ہیں، پانی میں چھلانگ لگانے سے چوٹ نہیں لگا کرتی۔ ہم میں سے ہر ایک کو تیرنا آتا ہے، ہم زندگی کے لیے یہ جدوجہد ضرور کریں گے۔ صرف اپنی زندگی کے لیے نہیں، اپنے ملک اور قوم کے لیے بھی۔ کیونکہ ہمارے دشمن کا مقصد جو بھی ہو، اس سے ملک اور قوم کو نقصان ہی پہنچے گا، فائدہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے اُن حالات میں ہم اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

''تب پھر سب سے پہلے میں نیچے چھلانگ لگاؤں گا۔'' انسپکٹر جمشید بولے اور ساتھ ہی انہوں نے بسکٹوں کے ڈبے نیچے پھینک دیے۔

''لیکن پہلے میں کیوں نہ چھلانگ لگاؤں۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''ایک ہی بات ہے، میرے پیچھے آپ چھلانگ لگا دیجیے گا، لیکن پہلے یہ دیکھ لیجیے گا کہ میں صحیح سلامت نیچے پہنچ گیا ہوں یا نہیں۔'' یہ کہتے ہی انہوں نے یک دم نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ بے ساختہ جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید نہایت تیزی سے نیچے جا رہے تھے اور پھر ایک زوردار چھپاکے کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، انہوں نے انسپکٹر جمشید کو پہلے پانی کے نیچے جاتے دیکھا، پھر وہ ابھرے اور تیرنے لگے، انہوں نے اوپر دیکھ کر ہاتھ ہلایا، گویا کہہ رہے ہوں۔ سب خیریت ہے۔ آ جائیے۔

فوراً انسپکٹر کامران مرزا نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ جلد ہی انہوں نے انہیں بھی تیرتے دیکھا۔

"اب کون جائے گا۔" خان رحمان نے پوچھا۔

"مم مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" پروفیسر داؤد نے بوکھلا کر کہا۔

"تب پھر پہلے آپ ہی جائیے۔" یہ کہتے ہوئے خان رحمان نے انہیں نیچے دھکا دے دیا۔ پروفیسر داؤد کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ نیچے کی طرف چلے۔

"یہ آپ نے کیا کیا انکل۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی خوف ان پر غالب آ چکا تھا۔ خود وہ کبھی بھی چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے۔ فکر نہ کرو، انہیں سنبھالنے کے لیے نیچے دو بہترین تیراک ہیں، ہاں! یہ فیصلہ کر لو کہ اب کون چھلانگ لگائے گا۔"

"اس میں فیصلہ کرنے کی کیا بات ہے۔ لیجیے میں چلا۔" محمود نے کہا اور چھلانگ لگانے کے لیے جھکا۔

"ارے ارے۔ ٹھہرو بھئی۔ پہلے پروفیسر داؤد کو تو ادھر ادھر ہو لینے دو۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے نیچے دیکھا۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے پروفیسر داؤد کو سنبھال لیا تھا اور اب وہ خود تیر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر محمود نے خدا حافظ کہتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ اس طرح باری باری وہ سب نیچے پہنچ گئے۔ خان رحمان نے سب سے آخر میں غار کے منہ کو ٹاٹا کہا۔

نیچے پہنچنے پر انہوں نے دیکھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔

"ارے باپ رے۔ یہ تو سمندر معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ سمندر تو خیر یہ نہیں ہے۔ کیونکہ پانی بالکل پرسکون ہے۔ ٹھہرا ہوا

ہے۔ یہ ضرور اس آبشار کا ہی پانی ہے۔ اس جھیل کے چاروں طرف ضرور آبادی ہو گی اور وہ اس جھیل کا پانی استعمال کرتے ہوں گے۔ ہمیں ایک سمت میں اپنا سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

"سفر شروع کرنے سے پہلے ہمیں اپنے بسکٹوں کے ڈبے پکڑ لینے چاہئیں۔" محمود نے گویا یاد دلایا۔

"اوہ ہاں! ڈبوں کو تو ہم بھول ہی گئے۔"

انہوں نے ادھر ادھر تیرتے ہوئے ڈبے پکڑے اور پھر ایک سمت میں تیرنے لگے۔ تقریباً تین گھنٹے تک تیرنے کے بعد کہیں جا کر انہیں جھیل کا کنارہ نظر آیا۔ کنارے کے دوسری طرف کچھ گھر بھی نظر آئے۔ وہ اور تیزی سے تیرنے لگے۔ اور جب وہ کنارے پر پہنچے تو چند ننگ دھڑنگ بچے کنارے پر کھڑے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، پھر وہ چیخنے لگے اور ان کی چیخیں سن کر کچھ مرد اور عورتیں کنارے کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔

"لو بھئی۔ اب ان سے مقابلہ کرو۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، بچوں نے خوف زدہ ہو کر انہیں بلا لیا ہے۔ ہماری ان کی کیا دشمنی۔ بلکہ ہم تو ان کے مہمان ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے کنارے پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا:

"ہم دوست ہیں، دشمن نہیں، مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں۔" یہ الفاظ انہوں نے اونچی آواز میں کہے، کیونکہ کنارے پر کھڑے لوگ انہیں اپنے ہی ملک کے دکھائی دیے تھے۔

"لیکن اس جھیل کی طرف سے آج تک کوئی نہیں آیا۔" ایک مرد نے

حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہمیں ایک غار میں بند کر دیا گیا تھا۔ ہم غار کے دوسری طرف چل پڑے۔ غار کا دوسرا سرا اس جھیل کے اوپر نکلا اور ہمیں اس میں چھلانگ لگانا پڑی۔''

''تم لوگوں کو غار میں کس نے بند کیا تھا۔''

''ہمارے دشمنوں نے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے، بیٹھ کر سنائیں گے۔''

''خیر آجاؤ، اگر تم کوئی ڈاکو یا لٹیرے ہوئے تو بچ کر نہیں جا سکو گے۔''

''فکر نہ کرو۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔''

اور وہ کنارے پر پہنچ گئے۔ پھر بستی والوں کے ساتھ ان کے گھروں کی طرف بڑھے۔ بستی والوں کے گھر کچے تھے، تاہم صاف ستھرے تھے۔ انہیں کچے فرش پر بٹھایا گیا، انہوں نے انہیں ایک فرضی کہانی سنائی۔ یہ کہانی مصیبت بھری تھی۔ بستی والوں نے ان کے سامنے بھنی ہوئی مچھلیاں رکھیں۔ اس وقت یہ خوراک انہیں ساری دنیا کی لذیذ چیزوں سے زیادہ پر لطف لگی۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر مچھلی کھائی اور آخر انسپکٹر جمشید نے ان سے پوچھا۔

''یہ بتائیے کہ ہم ملک کے کون سے حصے میں ہیں اور دارالحکومت یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''یہ ملک کا شمالی حصہ ہے۔ دارالحکومت یہاں سے تقریباً سو کلو میٹر دور ہے۔''

''ہم وہاں تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟''

''آپ لوگوں کو پہلے پیدل سفر کرنا پڑے گا۔ پھر آپ ایک گاؤں میں پہنچیں گے، وہاں سے آپ کو تانگے مل جائیں گے، تانگے آپ کو ایک چھوٹے قصبے میں پہنچا دیں گے، اس قصبے میں ایک گاڑی آکر رکتی ہے، وہ گاڑی آپ کو

دارالحکومت پہنچا دے گی۔''

''اوہ بہت بہت شکریہ۔ کیا آپ لوگوں میں سے کوئی ہمیں تانگوں والے گاؤں تک پہنچا دے گا۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں ہے کہ آپ کو دے سکیں۔ زندگی رہی تو اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کریں گے۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''ٹھہرو کامران مرزا! میرے پاس ہیرے کی ایک انگوٹھی ہے۔ ہم یہ انگوٹھی انہیں دے سکتے ہیں۔'' منور علی خان بول پڑے۔ وہ ان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اتنی دیر میں انگوٹھی انگلی سے نکال لی تھی۔

''ہیرے کی انگوٹھی۔'' بستی والوں کے منہ سے نکلا۔

''ہاں یہ بہت قیمتی ہے۔ شہر جا کر اسے بیچو گے تو بہت سارے پیسے ملیں گے۔'' یہ کہہ کر منور علی خان نے انگوٹھی انہیں دے دی۔

''بہت بہت شکریہ۔''

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ پھر تانگوں میں بیٹھ کر قصبے کا رُخ کر رہے تھے اور دو گھنٹے بعد انہیں وہ گاڑی مل چکی تھی اور پسنجر گاڑی آہستہ رفتار سے دارالحکومت کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ اڑ کر وہاں پہنچ جانا چاہتے تھے، لیکن ان حالات میں یہ گاڑی بھی غنیمت تھی۔ جس وقت وہ اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترے، شام کے پانچ بج رہے تھے اور یہ وقت تھا ان کے دفتر سے اٹھنے کا اور گھر کی طرف جانے کا۔ لیکن اس وقت وہ گھر کا رُخ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے حلیے عجیب ہو رہے تھے۔ چہروں پر بال بڑھ گئے تھے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے بغیر ٹکٹ سفر کیا تھا۔ سفر کے دوران ٹکٹ چیکر نہیں آیا تھا۔ اسٹیشن کے دروازے پر انہیں ضرور روکا جاتا، لیکن انسپکٹر جمشید انہیں ایک دوسرے راستے سے باہر نکال لائے تھے اور اب وہ تین ٹیکسیوں میں دفتر کی طرف اڑے

جارہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور پہلے تو انہیں بٹھانے پر تیار ہی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جب انسپکٹر جمشید نے انہیں جھاڑ پلائی تو وہ بوکھلائے اور انہیں لے جانے پر تیار ہو گئے۔

دفتر پہنچ کر وہ اترے، انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو چند منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"مجھے تو آج کرایہ ملتا نظر نہیں آتا۔ بھوکے ننگے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

ایک ڈرائیور نے بُرا سا منہ بنایا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بچ کر جائیں گے کہاں۔ میں اس دفتر کے تمام دروازوں سے واقف ہوں۔ یہاں کئی بار سواریوں کو لے کر آ چکا ہوں۔" دوسرا بولا۔

ادھر یہ لوگ آئی جی صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ چپراسی دروازے پر موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر بے تحاشہ غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ تیز لہجے میں بولا۔

"ارے۔ کدھر منہ اٹھائے چلے آرہے ہو۔"

"بھئی واہ۔ یہ تو ایک ہفتے میں ہی زمانہ بدل گیا۔ اگر ہم کہیں ایک ماہ بعد لوٹتے تو شاید پورا شہر ہی ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیتا۔" انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا۔

اب چپراسی زور سے چونکا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے انہیں بغور دیکھا اور پھر کپکپاتی آواز میں بولا۔

"ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ آپ ہیں۔"

"شیخ صاحب تشریف فرما ہیں یا نہیں۔"

"جی نہیں۔ وہ تو کانفرنس ہال گئے ہیں۔"

"کانفرنس ہال۔ لیکن کیوں۔" انسپکٹر جمشید زور سے چونکے۔

"اوہ ہاں۔ آپ لوگ تو تقریباً ایک ہفتے سے گم شدہ ہیں۔ آپ کو کیا

معلوم کہ آج کانفرنس ہال میں ساری دنیا کے اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔"

"اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس۔ یہ پروگرام کب بنا؟" انسپکٹر کامران مرزا کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تاہم افسران وہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ خیر۔ آیئے پہلے تو ٹیکسی ڈرائیوروں سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ سب نے ان کا ساتھ دیا۔ یہاں اکرام موجود تھا۔ ان کا چپراسی بھی موجود تھا۔ چپراسی کے ذریعے ٹیکسیوں کا بل بھجوایا گیا، ادھر اکرام حیرت کا بُت بنا بیٹھا تھا۔

"اکرام یہ سب کیا ہے۔ یہ کانفرنس اچانک کہاں سے ٹپک پڑی۔"

"مجھے تفصیلات معلوم نہیں سر۔ آئی جی صاحب ہی آپ کو بتا سکتے ہیں۔"

"لیکن وہ تو کانفرنس ہال جا چکے ہیں۔ اچھا۔ بتاؤ۔ کانفرنس کس وقت ہو رہی ہے۔"

"آج شام ساڑھے چھ بجے۔"

"گویا ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ پھر تو ہمارے پاس گھر جا کر کپڑے پہننے اور حلیے تبدیل کرنے کا وقت ہے۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں خان رحمان۔ اب باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس کانفرنس کو ملتوی کرانا ہوگا۔ ٹھہرو۔ میں فون کر کے شیخ صاحب سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے نمبر ملانے شروع کیے۔ تقریباً دس منٹ کی کوشش کے بعد کہیں جا کر انہوں نے شیخ صاحب کی آواز سنی۔

"اف خدایا۔ جمشید۔ یہ تم ہو۔ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔"

"ایک بار پھر دشمن کی قید میں۔ یہ باتیں تو بعد میں ہو جائیں گی سر۔ اس وقت تو آپ یہ بتایئے کہ کانفرنس کا پروگرام ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور پھر تم یہ پروگرام ملتوی کیوں کرانا چاہتے ہو۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسے کام نہیں چلے گا۔ ہم کانفرنس ہال پہنچ رہے ہیں۔ آپ اس کا انتظام کر دیں کہ ہمیں روکا نہ جائے۔"

"میں خود دروازے پر پہنچ رہا ہوں۔ کیونکہ حفاظتی انتظامات انتہائی سخت ہیں۔"

"اور ہمارے حلیے اس وقت عجیب ہیں، اس حالت میں تو ہمیں واقعی اندر نہیں گھسنے دیا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں دروازے پر ملوں گا۔"

"شکریہ جناب۔ ہم آ رہے ہیں۔"

انہوں نے اپنی الماری کھولی۔ اس میں سے کچھ پستول نکال کر سب کو ایک ایک دیا۔ یہ پستول مجرموں کے ان کے ہاتھ لگے تھے۔ پھر نوٹوں کی چند گڈیاں جیب میں رکھیں اور باہر نکلے۔ اب انہیں ٹیکسیوں میں سفر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تین جیپیں انہیں تیار مل گئیں۔ محمد یوسف اور بیگم کامران مرزا کو اکرام کے ساتھ انہوں نے گھر بھیج دیا تاکہ بیگم جمشید اور دوسروں کو ان کی واپسی کی خوش خبری بھی مل جائے اور دونوں بیگمات بھی آپس میں مل لیں۔

"ابا جان! آپ کانفرنس کو ملتوی کیوں کرانا چاہتے ہیں۔" محمود نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"ہمارا دشمن ہمیں شہر سے دور رکھنے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ یہ بات ہمیں اب تک معلوم نہیں۔ ہم اس کی قید سے ایک بار پھر نکل آئے ہیں اور آتے ہی ہم نے یہ سنا ہے کہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جب کہ اس کانفرنس کا پہلے سے کوئی پروگرام سننے میں نہیں آیا۔ جب تک میں یہ نہ جان لوں کہ یہ کانفرنس کن حالات میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس وقت تک کیسے اطمینان کا سانس لے سکتا ہوں۔ شہر پہنچتے ہی اگر ہم کانفرنس کی خبر نہ سنتے تو سب سے پہلے میں ایٹمی پلانٹ اور دوسری تنصیبات کو چیک کرنے کا پروگرام بناتا۔ لیکن اس وقت فوری ضرورت یہی ہے کہ اس کانفرنس کو ہونے سے روک دیا جائے۔ ہم یہ کیوں نہ فرض کریں کہ دشمن تمام اسلامی سربراہوں کو ایک ہی وقت میں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔" وہ جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"اوہ!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

"بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی اس کانفرنس کو ملتوی کرانے کے حق میں ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یا اللہ رحم۔ اگر ہمارے خوفناک دشمن کا منصوبہ یہی ہے تو یہ ایک انتہائی ہولناک منصوبہ ہے۔" خان رحمان نے کانپ کر کہا۔

"مجھے یہ کانفرنس اس لیے بھی کھٹک رہی ہے کہ اس کا پروگرام اچانک بنا ہے۔ ایک ہفتے پہلے جب ہم دشمن کی قید سے نکل آئے تھے۔ اس وقت آئی جی صاحب نے اس کانفرنس کا ذکر تک نہیں کیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں! معاملہ واقعی سنگین ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔"

آخر وہ کانفرنس ہال کے سامنے پہنچ گئے۔ شیخ نثار احمد اور ڈی آئی جی افتخار احمد خان فوراً ان کی جیپوں کی طرف لپکے۔

"آہ نہیں۔ یہ آپ لوگوں کی کیا حالت بن گئی ہے۔" شیخ صاحب دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ ان کی نظریں خاص طور پر انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ پر بھی تھیں۔

"ہماری حالت کو چھوڑیں ہم نے تقریباً سات دن ایک غار میں گزارے ہیں، میں چاہتا ہوں۔ اس کانفرنس کے پروگرام کو فوری طور پر روک دیا جائے۔"

"مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو، دوسری بات یہ کہ یہ ناممکن ہے سربراہوں کا جلوس گیسٹ ہاؤس سے روانہ ہو چکا ہے۔ پورا شہر مین روڈ کے دونوں طرف ان کے استقبال کے لیے موجود ہے۔ استقبال کرنے والے گیسٹ ہاؤس سے لے کر کانفرنس ہال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ان پر پھولوں کی بارش کر رہے ہیں۔ جلوس گیسٹ ہاؤس سے تقریباً ایک میل آگے آ چکا ہے۔ ایک گھنٹے تک تمام سربراہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ تم نے بتایا نہیں، تم یہ پروگرام رکوا کیوں دینا چاہتے ہو۔"

"جس دشمن نے ہمیں صدر جوناف کے ساتھ اغوا کیا تھا، اس دشمن نے ایک بار پھر ہمیں اغوا کرایا اور ایک غار میں بند کرا دیا۔ وہ ہمیں اس وقت تک غار میں بند رکھنا چاہتا تھا جب تک کہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کر لے۔ آخر اس کا منصوبہ کیا ہے۔ یہ تو ایک اتفاق تھا کہ ہم غار سے نکل آئے۔ اس وقت اگر ہم غار میں ہوتے تو یہ کانفرنس پروگرام کے مطابق ہوتی اور نہ جانے کیا ہو جاتا۔ لیکن اب جب کہ ہم واپس آ چکے ہیں۔ ہم اس امکان کو رد نہیں کر سکتے کہ دشمن کا پروگرام تمام اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ایک ہی وقت میں ختم کر دینا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ جانتے ہی ہیں، کیا ہو گا۔ تمام اسلامی ملکوں کا نظام ایک دم درہم برہم ہو جائے گا۔ وہ افراتفری کا شکار ہو جائیں گے اور دشمن ممالک ان حالات سے نہ جانے کیا کچھ فائدہ اٹھائیں۔"

"صدر جوناف کے ساتھ۔ آپ لوگوں کا اغوا۔ اور ملک سیرات پر دشمن کی

قبضے کے بعد ملک سیرات کے نام پر ہی یہ کانفرنس بلائی گئی ہے۔" شیخ صاحب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے جمشید۔ ایک ہفتہ پہلے اس کانفرنس کا ذکر تک سننے میں نہیں آیا تھا۔ ہمارے صدر کو چند دوست صدروں نے یہ کانفرنس بلانے پر مجبور کیا تھا اور وہ بھی فوری طور پر۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ملک سیرات پر قبضہ کیا گیا ہے اور صدر جوناف کو غائب کیا گیا ہے، بالکل اسی طرح دو بڑی طاقتوں نے بہت سے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے اور اس منصوبے پر بہت تیزی سے عمل ہونے والا ہے۔ دوست صدروں کے کچھ جاسوسوں نے انہیں یہ خوفناک اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ بس انہوں نے ہمارے صدر کو تمام حالات سے آگاہ کیا، اب چونکہ ہمارا ملک سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، اس لیے انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ کانفرنس یہیں بلائی جائے، ہمارے صدر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے چند دوست صدروں سے مشورہ کر کے تاریخ طے کی اور دعوت نامے بھیج دیے، اس طرح یہ کانفرنس اس قدر جلد بلوائی گئی۔ اور اب آپ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ کانفرنس کا پروگرام ملتوی کر دیا جائے۔ خطرے کی گھنٹی میرے کانوں میں بھی بجنے لگی ہے۔ اس میں ضرور ہمارے دشمن کی کوئی چال ہے۔ لیکن کانفرنس کو رکوانا میرے بس سے باہر ہے۔"

"تب پھر آپ صدر مملکت سے ہماری بات کرا دیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ میں کرا سکتا ہوں۔"

"اس سے پہلے کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ ایوان صدر کے حفاظتی

انتظامات کی کیا صورت ہے۔"

"اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ لوگوں کا نام لیا گیا تھا کہ حفاظتی انتظامات آپ لوگ سنبھال لیں گے، لیکن آپ تو غائب ہو چکے تھے۔ لہٰذا یہ کام ملٹری کے آفیسروں کے ذمے لگایا گیا، ہمارے محکمے کے دوسرے انسپکٹرز بھی نگرانی کا کام کر رہے ہیں۔ ان سب نے ایک ایک چیز چیک کر لی ہے۔ کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں پائے گئے۔ کوئی ڈائنامیٹ وغیرہ نہیں ملا۔"

"خیر پہلے تو ہم صدر مملکت سے بات کریں گے اور اس کے بعد عمارت کا خود جائزہ لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے۔ آئیے اندر چلتے ہیں۔"

وہ انہیں لے کر دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے پر کھڑے نگرانوں نے ان لوگوں کے حلیوں کو دیکھ کر حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں، لیکن چونکہ آئی جی صاحب ان کے ساتھ تھے، اس لیے کچھ کہہ نہ سکے۔ البتہ ان کے اندر داخل ہونے پر ان کے منہ ضرور کھلے۔

"یہ آئی جی صاحب کن لوگوں کو اندر لے جا رہے ہیں۔"

"شاید صفائی کرنے والے ہیں۔ اندر کہیں صفائی وغیرہ ناقص رہ گئی ہوگی۔"

وہ جس طرف سے بھی گزرے، لوگوں نے انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آئی جی صاحب نے بھی اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا۔ انہوں نے جھلا کر کہا:

"کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ پہلے آپ لوگ اپنے حلیے تبدیل کر لیتے، لباس اور پہن لیتے۔"

"اگر یہاں کچھ لباس مل جائیں تو ہم ضرور بدل لیں گے۔ گھر جا کر تبدیل کرنے کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہاں تو پھر بیروں کی وردیاں مل سکیں گی۔"

"چلیے خیر۔ صاف ستھری تو ہوں گی اور دوسرے ہمیں گھور گھور کر بھی نہیں دیکھیں گے۔"

"تو پھر۔ پہلے تو لباس تبدیل کرنا پسند کرو گے یا صدر مملکت سے بات کرنا۔"

"میں اور انسپکٹر کامران مرزا ان سے بات کر لیتے ہیں، باقی لوگ لباس تبدیل کرتے رہیں گے۔ اس طرح وقت ضائع نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظام کیے دیتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا ٹیلیفون والے کمرے میں داخل ہو رہے تھے جب کہ باقی لوگ بیرے بننے کے لیے دوسرے کمرے کا رخ کر چکے تھے۔

"صدر مملکت اس وقت ہیں کہاں؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جلوس کے ساتھ۔" انہوں نے کہا۔ اور آپریٹر سے بولے۔

"صدر مملکت کی کار سے ملاؤ۔"

"یس سر۔" اس نے کہا اور ایک فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگا، جونہی سلسلہ ملا اس نے ریسیور آئی جی صاحب کو دے دیا۔

"ہیلو جناب عالی۔ میں شیخ نثار آئی جی بول رہا ہوں۔ انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہائیں۔ یہ لوگ آ گئے۔ کہاں تھے یہ۔"

"دشمن کی قید میں۔ایک غار میں قید کر دیا گیا تھا انہیں۔"

"خیر۔ریسیور انہیں دے دیں۔" صدر مملکت بولے۔

شیخ صاحب نے ریسیور انسپکٹر جمشید کو دے دیا۔انہوں نے ریسیور کان سے لگایا تو لوگوں کے نعروں کی مدھم آوازیں کان سے ٹکرائیں۔

"ہیلو سر! یہ میں ہوں آپ کا خادم۔انسپکٹر جمشید۔"

"ہیلو جمشید۔بہت خوشی ہوئی کہ تم لوگ پھر دشمن کے قید سے نکل آئے ہو، لیکن یہ دشمن تم لوگوں سے چاہتا کیا ہے۔"

"وہ یہی چاہتا تھا کہ ہم اس کانفرنس کے موقع پر یہاں موجود نہ ہوں۔" انسپکٹر جمشید خشک آواز میں بولے۔

"کیا مطلب؟"

"جی ہاں! کیا آپ اس کانفرنس کو ملتوی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید۔یہ کیسے ہو سکتا ہے، جلوس کانفرنس ہال کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔سارا شہر استقبال کے لیے سڑک پر آ کھڑا ہوا ہے۔پوری دنیا کے رپورٹر اور فوٹو گرافر سڑک پر موجود ہیں۔بھلا اس پروگرام کو ملتوی کس طرح کیا جا سکتا ہے۔اور پھر سوال تو یہ ہے کہ کیوں؟"

"ہم خطرہ محسوس کر رہے ہیں سر۔تمام سربراہوں کو خطرہ ہے۔"

"اوہ!" دوسری طرف سے کہا گیا۔چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ان کی آواز سنائی دی۔

"نہیں جمشید۔یہ ناممکن ہے، کانفرنس کا پروگرام روکا نہیں جا سکتا۔اگر تم لوگ کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو تو کانفرنس شروع ہونے سے پہلے اس خطرے کو دور کر دو۔ابھی کافی وقت ہے۔"

"عمارت بہت بڑی ہے سر۔اتنے وقت میں ہم پوری عمارت کا جائزہ نہیں لے سکیں گے۔"

"لیکن جمشید۔میں کیا کروں۔مہمانوں سے کیا کہوں۔انہیں واپس کس طرح لے جاؤں۔لوگ کیا کہیں گے۔پوری دنیا کے اخبار کیا کیا سرخیاں نہیں لگائیں گے۔ہمارا ملک تو کہیں کا نہیں رہ جائے گا۔خدا نے تمہیں ہماری مدد کے لیے عین وقت پر بھیج ہی دیا ہے تو پھر اپنی صلاحیتوں سے کام لو۔یہ تمہارے ملک کی عزت کا سوال ہے۔تمہاری قوم کی بقا کا سوال ہے۔" صدر مملکت کی آواز جذبات سے بھاری ہو گئی۔

"بہت بہتر سر۔اگر آپ کا حکم یہی ہے تو یونہی سہی۔"

"شکریہ جمشید۔کانفرنس شروع ہونے میں ابھی تقریباً ایک گھنٹہ پندرہ منٹ باقی ہیں۔ایک گھنٹے تک مہمان ایوان میں پہنچیں گے۔گویا تمہارے پاس ایک گھنٹہ باقی ہے۔"

"جو اللہ کو منظور۔" انسپکٹر جمشید بولے اور صدر صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔

"ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دشمن نے کیا چال چلی ہے۔اس نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔عمارت میں خطرہ کہاں موجود ہے۔" انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

☆☆☆

وہ غائب تھا

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ آخر انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"گویا کانفرنس ملتوی نہیں ہو سکتی۔ خیر کوئی بات نہیں، اب ہمیں فوری طور پر بیروں کا لباس پہننا ہے اور اس کے بعد عمارت کے چپے چپے کی تلاشی لینی ہے۔" یہ کہہ کر وہ آئی جی صاحب کی طرف مڑے۔

"سر! آپ اتنا انتظام کرا دیں کہ کوئی شخص بھی عمارت سے باہر نہ جانے پائے، جو شخص بھی باہر جانے کی کوشش کرے، اسے پہلے ہمارے سامنے پیش کیا جائے، میرا مطلب مہمانوں سے نہیں۔ عمارت کے عملے سے ہے۔ اور ہاں۔ اس عمارت کا انچارج کون ہے۔ لباس تبدیل کرنے کے فوراً بعد ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ عمارت کے بارے میں پوری تفصیل معلوم ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آئیے۔ میں ڈریسنگ روم میں آپ دونوں کو پہنچا دوں۔ انچارج کو میں وہیں لے آؤں گا۔"

وہ ڈریسنگ روم میں داخل ہوئے تو اندر موجود تمام لوگ بیروں کے لباس میں نظر آئے۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنے قد و قامت کے مطابق لباس پہن لیے۔ بچوں کے جسموں پر البتہ لباس ذرا ڈھیلے ڈھالے لگ رہے تھے اور وہ کافی مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے، انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید انہیں دیکھ کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ ابھی وہ لباس تبدیل کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آئی جی صاحب ایک پتلے

دبلے اور لمبے سے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

"یہ ہیں اس عمارت کے انچارج ہیں۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی انچارج صاحب۔ آپ تشریف رکھیے۔ ہم آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ۔ یہ سب کیا ہے سر۔ یہ بیرے مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" انچارج نے گھبرا کر کہا۔

"یہ بیرے نہیں ہیں، انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا اور ان کے ساتھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حفاظتی انتظامات کو ایک بار احتیاطاً سے چیک کر لیا جائے۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے حیرت بھرے لہجے میں نکلا، پھر وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا اور سراسیمہ زدہ لہجہ میں بولا:

"پوچھیے۔ کیا پوچھنا ہے؟"

"اس عمارت کا کوئی نقشہ ہے آپ کے پاس۔"

"ایک کمرے میں عمارت کا ماڈل موجود ہے۔ اس کمرے میں دوسرے عجائبات بھی ہیں۔"

"چلیے۔ ہم ماڈل ہی دیکھ لیں گے۔ وہ نقشے سے بہتر رہے گا۔ اب یہ بتائیے۔ عمارت میں کتنے بیرے اور دوسرے خدمت گار کام کر رہے ہیں۔"

"ڈیڑھ سو بیرے موجود ہیں۔ ایک ہیڈ بیرا ہے۔ ہیڈ بیرے کے اوپر ایک کیپٹن ہے۔ جو کھانوں کا ماہر بھی ہے۔ کھانے اس کی نگرانی میں تیار کرائے جاتے ہیں۔ ایک بہترین ڈاکٹر موجود ہے۔ کھانوں کی تیاری کے بعد وہ تمام کھانوں کا جائزہ لیتا ہے اور جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے، کھانا مہمانوں کے آگے پیش نہیں کیا جاتا۔ عمارت کا اپنا بجلی گھر ہے۔ بجلی گھر کا عملہ الگ ہے۔ بجلی گھر کا انچارج ایک بہت

ماہر الیکٹریشن ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ پوری عمارت میں بجلی ایک لمحے کے لیے بھی فیل نہ ہو۔ چنانچہ دوہرا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کانفرنس روم میں ہر کرسی کے سامنے مائیک نصب ہیں، اس کا کام یہ بھی ہے کہ تمام مائیک ٹھیک ہوں، اگر کسی مائیک میں کوئی خرابی ہو تو اسے فوری طور پر دور کیا جائے، ایئر کنڈیشنر ٹھیک ٹھاک کام کرے۔ دوسرے بجلی کے آلات بھی بالکل درست ہوں۔ یہ اس کی ذمے داریاں ہیں۔"

"اور آپ کی ذمے داری کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پوری عمارت کا انچارج ہوں۔ ان سب کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، یا جس چیز میں کوئی خرابی ہوتی ہے، وہ مجھے اطلاع دیتا ہے۔ اور میں حرکت میں آجاتا ہوں۔"

"ہوں! عمارت میں جس قدر عملہ بھی کام کرتا ہے، اس کے ڈیوٹی اوقات کیا ہیں، کیا دن رات عملہ یہیں رہتا ہے؟"

"جی نہیں۔ عام طور پر ڈیوٹی اوقات صبح پانچ بجے تا رات دس بجے ہیں۔ ایمرجنسی حالت میں ڈیوٹی رات گئے تک جاری رہ سکتی ہے۔" انچارج نے بتایا۔

"ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد یہ سب لوگ یہاں سے چلے جاتے ہیں؟"

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"کیا سب کے سب ملازم پرانے اور جانے پہچانے ہیں یا اس موقعے پر کچھ نئے ملازم بھی رکھے گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ کوئی نیا ملازم نہیں رکھا گیا ہے۔"

"ہوں۔ اب آپ ہمیں ماڈل والے کمرے میں لے چلیے۔ ماڈل میں ہمیں دیکھنا ہے۔ کہ فلاں فلاں کمرہ کہاں ہے۔ آپ کا کمرہ کون سا ہے۔ کانفرنس روم کون سا ہے۔ اور بجلی گھر کہاں ہے ڈاکٹر کا کمرہ کہاں ہے، ہیڈ بیرا اور کیپٹن کے کمرے کہاں ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عجائب گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت انہیں دوسری چیزیں دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ انچارج کے پیچھے چلتے سیدھے ماڈل کے سامنے جا پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑا ماڈل تھا۔ عمارت کے بے شمار کمرے تھے۔ انچارج انہیں تفصیل سے بتانے لگا اور وہ کمروں کی تفصیل کو ذہن نشین کرتے چلے گئے۔

کانفرنس روم کی عمارت کے عین درمیان میں سب سے بڑا کمرہ تھا، یہ انڈے کی شکل کا بنایا گیا تھا، بقیہ کونوں کے باقی کمرے مستطیل ہی تھے۔ بجلی گھر بھی ایک بڑے کمرے میں قائم کیا گیا تھا، ڈاکٹر، ہیڈ بیرا اور کیپٹن کے کمرے عام کمرے تھے۔ جنہیں وہ اپنے دفاتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ماڈل کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید، انچارج سے بولے۔

"اب آپ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کریں گے۔ ویسے کیا آپ اپنے کمرے میں ہی جائیں گے؟"

"جی ہاں! مجھے وہیں رہ کر تمام معاملات کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے۔"

"یہ تو تھی عملے کی تفصیل۔ مہمانوں کا استقبال کرنے والے تو صدر مملکت اور وزراء کے سیکریٹریز وغیرہ ہوتے ہوں گے۔"

"جی ہاں! ان کا انتظامی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔" اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ انچارج جانے کے لیے مڑا، لیکن پھر ہچکچاہٹ کے انداز میں رُکا، ان کی طرف مڑا اور بولا۔

''میں سمجھا نہیں۔ آپ لوگ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''ہم صرف یہ جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ عمارت میں کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔''

''یہ کام تو پہلے بھی کیا جا چکا ہے، محکمہ سراغ رسانی کے ماہر اور ملٹری آفیسر ایک ایک چیز چیک کر چکے ہیں۔''

''ہم اپنے طور پر چیک کرنے کے عادی ہیں، ہماری بات کے جواب میں اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ چیکنگ کرنے کا کوئی وقت ہے، اگر چیک ہی کرنا تھا تو دو چار گھنٹے پہلے چیکنگ شروع کی جاتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ابھی ابھی دشمن ملک کے ایک جاسوس کی قید سے فرار ہو کر آئے ہیں اور سیدھے یہیں آئے ہیں، اسی لیے آپ کو بیروں کے لباس میں نظر آ رہے ہیں۔''

''شکریہ جناب۔ میں نے اُلجھن محسوس کی۔ سو پوچھ لیا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔''

آخر انچارج چلا گیا۔ وہ سب چند لمحے تک خاموش کھڑے رہے آخر انسپکٹر کامران مرزا نے دبی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''ہمیں استقبال کے لیے آنے والے سیکرٹریوں وغیرہ کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس انچارج کو، ہیڈ بیرے کو، اس کیپٹن کو، ڈاکٹر کو اور الیکٹریشن کو چیک کرنے کی ضرورت ہے۔ گویا یہ پانچ آدمی ہو گئے۔ کیوں نہ ہم پانچ پارٹیوں میں بٹ جائیں۔ اس کے بعد ہم سب مل کر کانفرنس روم کو بھی چیک کریں گے۔ خطرہ اگر

ہو سکتا ہے تو کانفرنس روم میں۔ اس کے فرش اور دیواروں کو بھی چیک کرنا ہو گا۔ تمام غسل خانے بھی دیکھنے ہوں گے۔''

''لیکن مہربانی فرما کر ہمیں اس طرح تقسیم کیجیے گا کہ وقت ضائع کرنے والے بھی وقت ضائع نہ کر سکیں۔'' فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

''کیا تمہارا اشارہ میری اور آفتاب کی طرف ہے۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔

''عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اور اگر کانفرنس بخیر و خوبی ختم ہو گئی تو آج رات سے ہی ہمیں اپنے ملک کی اہم ترین تنصیبات کا جائزہ شروع کرنا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

''جی بہتر۔ تو پھر آپ ہی فیصلہ کر دیں۔''

''ہاں۔ فاروق اور آصف ہیڈ بیرے کو چیک کریں گے، محمود اور آفتاب اس انچارج کو، فرزانہ اور فرحت کیپٹن کو۔ انسپکٹر کامران مرزا اور منور علی خان ڈاکٹر کو، میں، خان رحمان اور پروفیسر داؤد الیکٹریشن کو چیک کریں۔ چیک کرنے کے بعد ہم سب یہیں جمع ہوں گے اور اگر کہیں کوئی گڑبڑ پائیں گے تو اس گڑبڑ کو سب کے علم میں لائیں گے۔ اس کے بعد ہم کانفرنس روم میں ملیں گے۔ کیا یہ پروگرام مناسب رہے گا۔'' یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

''بالکل مناسب رہے گا، اس طرح وقت بچے گا۔'' محمود بولا۔

''تب پھر اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہو جاؤ۔'' انسپکٹر جمشید بولے اور وہ مختلف سمتوں میں بڑھے۔ فاروق اور آصف ہیڈ بیرے کے کمرے میں دستک دیے بغیر ہی داخل ہو گئے۔ اس نے انہیں چونک کر دیکھا اور پھر تلملا کر بولا:

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اجازت لے کر اندر کیوں نہیں داخل ہوئے۔"

"اس لیے کہ یہ ہماری پرانی عادت ہے، کیوں فاروق۔" آصف نے فوراً کہا۔

"تمہاری ہوگی پرانی، میری تو یہ بالکل نئی عادت ہے، بلکہ تم چاہو تو نئی نویلی بھی کہہ لو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"سنا آپ نے میرے ساتھی کا جواب۔" آصف مسکرایا۔

"ارے ارے۔ معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونے پر تلے ہو۔" اس نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ ہمارے گھر میں تولیے بہت ہیں، اور وزن کرنے کی مشین بھی ہے، لہٰذا ہمیں ہاتھ دھونے پر تلنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"تم تو بالکل لڑکے ہو۔ تمہیں ملازم رکھا کس نے؟" ہیڈ بیرے نے چلا کر کہا۔

"آپ ہیڈ ویٹر ہیں، یہ بات تو آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ ہمیں ملازم کس نے رکھا ہے۔" آصف بولا، پھر وہ فاروق کی طرف مڑا۔

"بھئی فاروق اس طرح تو وقت ضائع ہوگا۔"

"ارے اچھا، تو پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" اس نے چونک کر کہا۔

"چلو اب تو بتا دیا ہے نا۔ اب کیوں اسے ضائع کیے دے رہے ہو۔" آصف نے جل کر کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو سنیے مسٹر ہیڈ بیرا۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل ہی نہیں ہے۔ کیا سمجھے۔"

"خاک میں تم دونوں کو گولی ماردوں گا۔"

"ارے باپ رے۔ تو آپ کے پاس پستول بھی ہے۔ یہ بات ہمیں معلوم نہیں تھی اور نہ انچارج صاحب نے بتائی۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"کون سے انچارج کی بات کر رہے ہو۔" ہیڈ بیرے نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"اس عمارت کے انچارج کی۔ دراصل ہم بیرے نہیں ہیں، بلکہ سراغ رساں پارٹی کا ایک حصہ ہیں۔ اور یہ تفتیش کرتے پھر رہے ہیں کہ عمارت میں کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔" آصف نے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ اختیار تم لوگوں کو کس نے دیا؟"

"صدر مملکت نے۔ اگر یقین نہیں تو آئی جی صاحب سے تصدیق کر لیں۔ یا پھر اپنے انچارج سے تصدیق کر لیں۔" آصف بولا۔

"میں ضرور تصدیق کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جلد ہی سلسلہ مل گیا۔

"ہیلو انچارج صاحب۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"کیا تمہارا اشارہ تفتیش کرنے والی جماعت کی طرف ہے۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی ہاں!"

"یہ لوگ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھی ہیں۔ وہ خود عمارت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ آئی جی صاحب کی بھی ہدایات ہیں کہ انہیں ہر چیز چیک کرنے دی جائے۔"

"اوہ۔ بہت بہتر!" اس نے کہا اور پھر ریسیور رکھتے ہوئے ان کی طرف

مڑا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ میں اطمینان کر چکا ہوں۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔"

"سب سے پہلے تو ہم آپ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں اور پھر آپ سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے کمرے کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ ٹھوک بجا کر بھی دیکھا۔ کمرے میں انہیں اور تو کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی، البتہ میز کے ایک کونے پر ایک عجیب سا بٹن ضرور لگا تھا اور اس بٹن کے پاس ہی ایک ننھا سا سرخ رنگ کا بلب۔ وہ ان دونوں چیزوں کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ آخر انہوں نے معائنہ ختم کر دیا اور آصف نے کہا۔

"اور تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک۔ بس اس بٹن اور بلب کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اس کا تعلق انچارج کے کمرے سے ہے۔ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کریں تو اپنی طرف کا بٹن دبا دیں گے، یہاں کا بلب جل اٹھے گا اور میں ان کی مدد کو پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح اگر میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو میں یہ بٹن دبا دوں گا۔"

"تو کیا یہ انتظام یہاں پہلے سے ہی ہے۔"

"جی ہاں!"

"آپ صبح کس وقت آتے ہیں؟" آصف نے پوچھا۔

"صبح پانچ بجے۔"

"دروازے پر آپ کو روکا جاتا ہے چیکنگ کے لیے۔" فاروق بولا۔

"جی ہاں! گیٹ کیپر پہلے ہمیں اچھی طرح دیکھتا بھالتا ہے اور پھر اندر آنے دیتا ہے، وہ بہت پرانا ملازم ہے اور اندر کام کرنے والوں میں سے ایک ایک کو پہچانتا ہے۔"

"بہت خوب! آپ رات کو دس بجے جاتے ہیں۔"

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"آپ رہتے کہاں ہیں؟" آصف نے پوچھا اور فاروق نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کے خیال میں اس سوال کی کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن آصف نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، بدستور ہیڈ بیرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"فرخ آباد میں، گلی نمبر تین، مکان نمبر سولہ۔" اس نے کہا۔

"شکریہ! کیا وہاں فون ہے؟"

"جی ہاں! حکومت نے میرے گھر میں فون لگوا کر دیا ہے تاکہ کسی وقت بھی مجھے بلایا جا سکے۔"

"آپ اپنے گھر کا فون نمبر بتا دیں۔" آصف بولا۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے الجھ کر کہا۔

"ضرورت ہو یا نہ ہو۔ آپ گھر کا نمبر بتا دیں۔"

"جی بہتر۔ نوٹ کر لیں ۳۶۴۵۴ ہے۔" اس نے کہا۔

انہوں نے نمبر نوٹ کیے اور باہر نکل آئے۔

"یہ اس کے گھر کا پتا اور فون نمبر لینے کی کیا ضرورت تھی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"جو معلومات بھی حاصل ہو جائیں اچھا ہے۔ آخر تمہیں کیوں اعتراض

ہے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہا ہے کہ ہم کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکے۔" فاروق نے پریشان آواز میں کہا۔

"ابھی کوئی کام کی بات ہو تو معلوم بھی کریں۔ کم از کم ہیڈ بیرے کے ہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔"

"مجھے اس بٹن اور بلب کا رہ رہ کر خیال آ رہا ہے۔" فاروق نے دبی آواز میں کہا۔

"جب کہ مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔"

"ہمیں انچارج سے پوچھنا پڑے گا کہ یہ انتظام کیا یہاں ہمیشہ سے ہے یا اس مرتبہ کیا گیا ہے۔"

"انچارج کے کمرے میں محمود اور آفتاب گئے ہیں، ان سے معلوم ہو جائے گا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"آخر تم اس بلب اور بٹن کو کوئی اہمیت دینے کو تیار کیوں نہیں ہو۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"تم جو اہمیت دے رہے ہو۔ آؤ عجائب روم میں چلیں۔ وہاں چل کر ہم ہیڈ بیرے کے گھر فون کریں گے۔"

"چلو۔ میں نہیں سمجھتا تم فون کر کے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔" اس نے برا سا منہ بنایا اور عجائب روم کی طرف چلنے لگا۔ آصف بھی اس کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

عجائب روم میں ابھی اور کوئی واپس نہیں آیا تھا۔

"یار سب سے پہلے ہم نے تفتیش ختم کر دی۔ کمال ہے۔" آصف کے منہ

سے نکلا۔

"دوسرے لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔ آخر ہمیں وقت کا بھی تو احساس کرنا ہے۔" فاروق بولا۔

آصف نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی، لیکن ریسیور کسی نے نہ اٹھایا۔

"عجیب بات ہے، گھنٹی بج رہی ہے۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا۔" آصف بڑبڑایا۔

"ہو سکتا ہے ہیڈ بیرے کے گھر والے کہیں گئے ہوئے ہوں۔" فاروق نے لاپروائی سے کہا۔

"اس صورت میں اسے بتا دینا چاہیے تھا۔ جب ہم نے اس سے فون نمبر مانگا تھا۔" آصف الجھ کر بولا۔

"تو اس سے پوچھ لیتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بہتر رہے گا۔"

دونوں ایک بار پھر اٹھے اور ہیڈ بیرے کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

"جب وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا، دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور ہیڈ بیرا غائب تھا۔

☆☆☆

نولی فوبیا

محمود اور آفتاب انچارج کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھ کر ذرا بھی نہ چونکا۔

"یار محمود! ہم سے ناانصافی ہوئی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"وہ کیسے؟" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ ایسے کہ انچارج صاحب سے تو ہم پہلے ہی سب معلومات حاصل کر چکے ہیں، اب ان سے بھلا کیا پوچھنا رہ گیا ہے، لہٰذا ہمیں ایک ایسا کام سونپا گیا ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔" یہ کہہ کر آفتاب انچارج کی طرف مڑا اور اس سے بولا۔

"انچارج صاحب! معاف کیجیے گا، ہم اتنی جلدی پر آپ سے سوالات کرنے آ گئے۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ عجیب سرپھرے ہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، سرپھرے تو ہم واقعی ہیں، اس میں تو ایک فیصد بھی شک نہیں، پھر بھی آپ مہربانی فرما کر کوئی خیال نہ کریں، ہم آپ سے سوالات نہ کرنے کے برابر کریں گے اور کمرے کا جائزہ زیادہ لیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"جی نہیں بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" اس نے دونوں کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"شروع میں واقعی کسی کو بھی ہمارے تلاشی لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، یہ اعتراض تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم کوئی کام کی چیز۔" آفتاب تیزی سے کہتا جا رہا تھا کہ محمود نے اسے ٹوک دیا:

"آفتاب! ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں، ایسا نہ ہو، ہم یہاں باتیں بگھارتے رہ جائیں اور دوسرے فارغ ہو کر اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں ہمیں ایک دوسرے سے ملنا ہے۔"

"بات یہ بھی معقول ہے اور اس حد تک معقول ہے کہ میں دم نہیں مار سکتا، آپ اس لفظ کو دم خیال نہ کیجیے گا۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"آفتاب۔ آفتاب۔ وقت کی نزاکت کا احساس کرو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"یہی تو مجھ میں عیب ہے۔ خیر۔ اب پوری طرح احساس کیے لیتا ہوں۔ ہاں تو تم اپنا کام شروع کرو۔" اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"اور تم کیا میرا منہ دیکھو گے کھڑے رہ کر۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"جی نہیں۔ فکر نہ کرو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

دونوں نے کمرے کی تلاشی شروع کی۔ انچارج اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا اور اکتائے ہوئے انداز میں ان کی کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ یکا یک آپ لوگوں کو کس طرح خیال آ گیا کہ اس عمارت میں کوئی گڑبڑ ہے۔" آخر اس نے کہا۔

"یکا یک تو خیر نہیں، یہ خیال آہستہ آہستہ آیا ہے۔" آفتاب بولا۔

"یہ کیا جواب ہوا۔" انچارج نے جھلا کر کہا۔

"میں ایسے جوابات دینے کا بہت ماہر خیال کیا جاتا ہوں۔" آفتاب نے

خوش ہو کر کہا۔ ادھر محمود کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے، وہ ایک ایک دراز الماری اور کمرے کی ہر چیز کو بغور جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن اسے کوئی کام کی چیز نہ ملی۔ آخر میں اس کی نظر میز کے کونے پر لگے بٹن اور سرخ بلب پر پڑی۔

"یہ کیا چیز ہے مسٹر انچارج؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کسی وقت اگر مجھے کوئی خطرہ محسوس ہو تو اپنے دوسرے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے صرف یہ بٹن دبانا ہوگا۔ اسی طرح اگر انہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو وہ اپنی میز کا بٹن دبا دیں گے۔"

"ساتھیوں سے آپ کی کیا مراد ہے۔"

"اس عمارت میں کام کرنے والے سب میرے ساتھی ہیں، یعنی ہیڈ بیرا، کیپٹن صاحب، ڈاکٹر صاحب، الیکٹریشن صاحب۔"

"اور بیرے۔"

"بیروں کا کام اور ہے۔ تاہم وقت پڑنے پر ان سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔"

"لیکن بھلا اس عمارت میں آپ لوگوں کے لیے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا ہے تو پھر آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" انچارج کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"ہم تو ایک خاص وجہ سے یہاں آئے ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ انتظام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اس کا جواب تو الیکٹریشن صاحب ہی دے سکیں گے۔" یہ کام انہوں نے ہی کیا ہے۔ خطرے وغیرہ کا خیال سب سے پہلے انہیں ہی آیا تھا۔"

"خیر۔ ہمارے ساتھی ان کے کمرے میں بھی جائیں گے اور وہ ان سے یہ سوال ضرور پوچھیں گے۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"شکریہ" اس کے منہ سے نکلا اور دونوں باہر نکل آئے۔ عجائب روم میں آئے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"حیرت ہے، ہم سب سے پہلے آ گئے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"تو کیا تمہارا خیال تھا کہ ہم سب سے آخر میں لوٹ کر آئیں گے۔"

"تم بھی فاروق کے برابر ہو، کام کی بات تو کرنا جانتے ہی نہیں۔" محمود نے جھنجھلا کر کہا۔

اسی وقت انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔

☆☆

فرزانہ اور فرحت نے کیپٹن کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ اس نے ان دونوں کو حیران ہو کر دیکھا اور پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

"آپ لوگ وہی تو نہیں جو یہاں تفتیش کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔"

"ہیں تو وہی۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر اندر تشریف لے آئیے۔ اور ذرا جلدی سے اپنا کام کر ڈالیے، کیونکہ مجھے راؤنڈ پر نکلنا ہے۔"

"بہت بہتر! آپ پسند کریں تو راؤنڈ پر چلے جائیں، ہم کمرے کی تلاشی لے لیں گے۔" فرحت نے مشورے کے انداز میں کہا۔

"نہیں! تلاشی میرے سامنے ہی لی جائے گی۔" اس نے منہ بنایا۔

"بہت اچھا۔"

دونوں نے سرگرمی سے کمرے کو کھنگالنا شروع کیا، لیکن کوئی کام کی چیز نہ

مل سکی۔ اب وہ اس کی طرف مڑیں۔

"آپ بیروں کے کام کی نگرانی کرتے ہیں۔"

"ہاں!" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"یہ خیال رکھیے کہ ہم صدر مملکت کی طرف سے اس عمارت میں چھان بین کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے ہم سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا تو ہم آپ کی شکایت بھی لگا سکتے ہیں۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"اب بتائیے۔ صبح جب آپ آتے ہیں تو گیٹ پر اپنی شناخت وغیرہ بھی کراتے ہیں۔"

"گیٹ کیپر نہ صرف ہمیں شناخت کرتا ہے۔ بلکہ تلاشی بھی لیتا ہے۔ تاکہ ہم میں سے کوئی، کوئی غلط چیز اندر نہ لا سکے اور جاتے وقت بھی ہم سب کی تلاشی لی جاتی ہے، تاکہ ہم اندر کی کوئی چیز باہر نہ لے جا سکیں۔"

"ایسا ہر روز ہوتا ہے۔" فرحت نے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے کہا۔ یہ سن کر فرزانہ نے فرحت سے کہا۔

"آؤ فرحت۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ چلیں۔"

دونوں باہر نکل آئیں۔ فرحت کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے، آخر اس نے کہا۔

"یہ کیا۔ تم نے اچانک ہی باہر نکل آنے کا پروگرام بنا لیا۔"

"میرا خیال ہے۔ ہمیں گیٹ کیپر سے بھی ملاقات کرنی چاہیے۔" فرزانہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ آؤ پھر۔"

دونوں باہر کی طرف چلیں۔ باہر جانے کے لیے انھیں لان کے پاس سے گزرنا پڑا۔ شہری مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ سب لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ ان میں آئی جی صاحب بھی تھے۔ اتفاق سے انہوں نے ان دونوں کو دیکھ لیا، وہ اٹھے اور تیر کی طرح ان کی طرف بڑھے۔

"ہیلو فرزانہ۔ خیر تو ہے۔"

"جی ہاں! ابھی تک تو سب خیریت ہے۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔"

"تو تم باہر کہاں جا رہی ہو۔"

"گیٹ پر۔ گیٹ کیپر سے چند سوالات کرنے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔ جونہی کوئی بات معلوم ہو۔ مجھے خبر کرنے کی کوشش کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں اور اگر آپ کو کوئی اطلاع وغیرہ ملے تو عجائب روم میں ہمیں خبر کر دیجیے گا۔"

"میں یہی کروں گا۔"

"شکریہ انکل۔" دونوں آگے بڑھ گئیں، آئی جی صاحب انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب ہمدردانہ سی کیفیت تھی، وہ سوچ رہے تھے۔ یہ لوگ بھی کتنے محب وطن ہیں۔ اتنے دنوں تک غار میں بند رہے۔ اور واپس آنے کے فوراً بعد۔ بغیر ایک لمحہ آرام کیے۔ یہاں آ گئے۔ کاش سبھی لوگ اپنے وطن سے اس حد تک محبت کرنے لگیں۔

گیٹ کیپر کوئی ملٹری آفیسر تھا۔ وہ اکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کی وردی چمک رہی تھی۔

"ہیلو!" فرزانہ نے اس کے نزدیک ہوتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اس

نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بیروں کے لباس میں دیکھ کر اس کا منہ نفرت سے بھنچ گیا۔

"کیا بات ہے۔" اس نے جھلا کر پوچھا۔

"ہم ایک تفتیشی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ صدر مملکت کی مرضی سے یہاں چھان بین کر رہے ہیں۔ خیال ہے کہ عمارت میں کوئی گڑبڑ کی گئی ہے، اس گڑبڑ کا پتا چلانے کی کوششوں میں ہم مصروف ہیں۔ اس سلسلے میں آپ سے بھی چند سوالات کرنا ہیں، اگر آپ پسند کریں۔ اگر نہیں تو ہم آئی جی صاحب سے رابطہ قائم کریں گے۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا تم دونوں بھی بیرے ہو۔" اس نے چونک کر کہا۔

"بیروں سے اتنی نفرت کیوں، کیا بیرے انسان نہیں ہوتے۔" فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

"اس بحث کو چھوڑیں اور کام کی بات کریں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔"

"آپ اندر کام کرنے والے عملے کی اندر داخل ہوتے اور باہر نکلتے وقت تلاشی لیتے ہیں۔ کیا آج صبح ان میں سے کوئی شخص کوئی چیز لے کر اندر داخل ہوا تھا۔"

"کوئی شخص بھی کوئی چیز لے کر اندر داخل نہیں ہوا۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"کیا آپ کو اچھی طرح یاد ہے۔"

"ہاں بہت اچھی طرح۔" اس نے کہا۔

فرزانہ اور فرحت مایوسانہ انداز میں مڑیں اور پھر فرحت ٹھٹھک کر رہ گئی۔

فرزانہ نے بھی اسے ٹھٹکتے صاف محسوس کیا۔ جلدی سے مڑ کر دیکھا اور پھر اس کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا، تاہم اس نے اپنی حیرت گیٹ کیپر سے کسی نہ کسی طرح چھپالی اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی۔ فرحت پہلے ہی آگے بڑھ چکی تھی۔ دونوں کے چہروں پر جوش کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ عجائب روم میں داخل ہوئیں تو محمود اور آصف کو اپنے سامنے پایا۔

"تم دونوں قدرے گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی ہو۔ خیر تو ہے۔"

"ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کہ سب خیریت ہے یا نہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔ تم دونوں کیا تیر مار کر آئے ہو۔" فرزانہ نے گول مول جواب دیا۔

"تیر بے چارے یہاں کہاں۔ کہ مار سکتے۔" محمود نے سرد آہ بھری۔

"گویا خالی ہاتھ لوٹے ہو۔" فرحت نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اور تم تو جیسے پورا ترکش خالی کر آئی ہو۔"

"ہاں۔ بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" فرزانہ شوخ انداز میں مسکرائی۔

"کیا مطلب۔ کیا تم نے کوئی خاص بات معلوم کرلی ہے۔ گویا انچارج کے کمرے میں کوئی گڑبڑ پائی گئی ہے۔"

"نتیجہ نکالنے میں اتنی جلدی نہ کرو۔"

"کیوں کیوں۔ تم دونوں انچارج کے کمرے میں ہی گئی تھیں نا۔"

"ہاں، لیکن انچارج کے کمرے میں ہمیں کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کر سکتی۔ لیکن ہم انچارج کے کمرے سے سیدھے ادھر نہیں آ گئے۔ گیٹ کیپر سے بات کرنے چلے گئے تھے۔ اور گیٹ کیپر سے ملاقات ذرا عجیب ثابت ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" دونوں چونکے۔

"ہم نے بھی کہا ہے کہ گیٹ سے ملاقات ذرا عجیب ثابت ہوئی ہے۔ عشرت میں کوئی بات نہیں کی۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"لیکن ملاقات عجیب کس طرح ثابت ہوئی ہے۔" "یہ بھی تو بتاؤ۔"

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ دروازے کی طرف مڑے۔

☆☆

انسپکٹر کامران مرزا اور منور علی خان ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں آپ لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

انہوں نے دیکھا، وہ ایک لمبے قد کا پتلا دبلا سا آدمی تھا، جسم پر ڈاکٹروں والا کوٹ تھا، میز پر ڈاکٹری آلات رکھے تھے، چہرے پر ایک خوش گوار مسکراہٹ تھی۔

"ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! انچارج نے مجھے فون پر سب کچھ بتا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اف اللہ۔" اچانک انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دھڑام سے گر پڑے، گرتے ہوئے ان کا سر بھی میز کے کونوں سے ٹکرایا اور اس زور سے ٹکرایا کہ پیشانی سے خون نکل آیا۔

"ارے ارے۔ یہ کیا ہوا۔" ڈاکٹر بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کامران مرزا میرے دوست۔" منور علی خان گھبرا گئے اور انہوں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ ذرا دیکھیے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر ان پر جھک گیا۔ اس نے پہلے ان کی نبض دیکھی اور پھر حیران ہو کر بولا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ مرگی کے مریض تو نہیں ہیں۔"

"نہیں تو۔" منور علی خان بولے۔

اس وقت انسپکٹر کامران مرزا نے آنکھیں کھول دیں اور کمزور سی آواز میں بولے۔

"مجھے نولی فوبیا کی بیماری ہے۔ اس مرض میں آدمی اس طرح اچانک گر پڑتا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر پٹی کر دیں۔ میں تھوڑی دیر تک خود بخود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اوہ ہاں۔ کیوں نہیں۔ ضرور۔" ڈاکٹر نے کہا اور پٹی کا سامان الماری سے نکالنے لگا۔

"آپ کو تو نولی فوبیا کے بارے میں معلوم ہی ہے۔"

"ہاں! بہت اچھی طرح۔" ڈاکٹر نے پرسکون آواز میں کہا اور پٹی کرنے لگا۔ اس کے فارغ ہونے پر وہ بولے۔

"آپ سے سوالات اُدھار رہے۔ میرا خیال ہے، مجھے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔"

"آپ کو پہلے ایک انجکشن لے لینا چاہیے۔" ڈاکٹر بولا۔

"لیکن میرے ڈاکٹر نے تو ہدایت کر رکھی ہے کہ اس مرض کے حملے میں کوئی دوا نہ لوں۔"

"آپ کے ڈاکٹر کا خیال غلط ہے۔ اب اس مرض کا ٹیکہ ایجاد ہو چکا ہے۔" اس نے کہا۔

"پھر بھی اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر انجکشن نہیں لگواؤں گا۔" منور علی خان۔ "مجھے سہارا دو۔"

انہوں نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور پھر باہر لے آئے۔ سہارا دیے ہوئے وہ جاب روم کی طرف بڑھنے لگے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو اندر موجود ان کے ساتھی گھبرا گئے۔

"ارے۔ یہ کیا ہوا؟" آفتاب نے بے تاب ہو کر کہا۔

"انہیں نولی فوبیا ہو گیا ہے۔" منور علی خان بولے۔

"نولی فوبیا۔ یہ کیا ہوتا ہے۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ایک بیماری کا نام ہے۔ جس میں آدمی ایک دم دھڑام سے گر پڑتا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"لیکن تایا جان کو تو ایسی کوئی بیماری نہیں ہے۔" آفتاب نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بعض اوقات ضرورتاً بھی ایسی بیماری پیدا کر لی جاتی ہے۔ یوں تو اس دنیا میں نولی فوبیا نام کی کوئی بیماری سرے سے ہی موجود نہیں ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اچانک سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

عین اسی وقت انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔ وہ چونک کر دروازے کی طرف مڑے۔

☆☆

انسپکٹر جمشید، پروفیسر داؤد اور خان رحمان بجلی گھر میں داخل ہوئے

دروازے انہیں کھلے ملے تھے۔ اندر کچھ لوگ مشینوں پر کام کرتے نظر آئے۔ کمرے کے آخر میں ایک بھاری اور بڑی سی میز پر ایک پتلا دبلا معمولی سے قد کا آدمی بیٹھا نظر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔

"آئیے جناب آئیے۔ مجھے آپ لوگوں کی آمد کی امید تھی، انچارج نے فون کر دیا تھا، لیکن میں حیران ہوں کہ آپ لوگ کیا دیکھتے پھر رہے ہیں۔"

"یہ دیکھ رہے ہیں کہ عمارت میں کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں، کیوں کہ اس کے امکانات موجود ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"خیر خیر مجھے اس سے کیا، یہ آپ کا کام ہے، بجلی گھر حاضر ہے اچھی طرح دیکھ لیجیے۔"

انہوں نے چیکنگ شروع کی۔ اس چیکنگ میں پروفیسر داؤد پیش پیش تھے۔ کیونکہ انہیں بجلی کے کام کا کافی حد تک تجربہ تھا، ایک جگہ انہیں تین عجیب سے بٹن لگے نظر آئے۔ یہ بٹن ان کی سمجھ میں نہیں آئے۔

"مسٹر الیکٹریشن۔ یہ بٹن میری سمجھ میں نہیں آئے۔" انہوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

ان بٹنوں کا تعلق آوازوں کے نظام سے ہے، کانفرنس روم میں جو مائیک لگے ہیں، ان کا تعلق انہی تین بٹنوں سے ہے۔ پہلا بٹن دبا دیا جائے گا تو مائیک کام کرنے لگ جائیں گے۔ پورے ہال میں ہر مائیک کی آواز صاف طور پر سنائی دے گی، دوسرا بٹن دبانے پر ہر مائیک سے نکلنے والی تقریر ٹیپ ہوتی چلی جائے گی، رہ گیا تیسرا بٹن۔ آوازوں کے نظام میں کسی وقتی خرابی کی صورت میں اسے دبا دیا جائے گا اور دوسرا انتظام کام کرنے لگے گا۔"

"بہت خوب۔ بہت شاندار انتظام ہے یہ تو، میرے خیال میں یہ سا

نظام آپ نے اپنے تجربے سے کام لے کر قائم کیا ہے۔"

"جی ہاں! میں اپنے ملک کا سب سے بہترین الیکٹریشن ہوں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

انہوں نے باقی تمام بجلی گھر کا بھی جائزہ لیا، لیکن کہیں کوئی گڑبڑ نظر نہ آئی۔

آخر وہ الیکٹریشن کی میز کی طرف آئے۔

"آپ یہاں کب سے ملازم ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"تقریباً دس سال سے۔" اس نے کہا۔

"اس دوران کسی تقریب کے دوران بجلی کے نظام میں کبھی کوئی خرابی پیدا ہوئی۔"

"آج تک نہیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔ یہ بات میں نے اپنی ملازمت کی درخواست میں لکھ کر دی تھی۔

"بہت خوب! آپ ایک باعزت آدمی ہیں۔ شکریہ اب ہم چلتے ہیں۔"

وہ بجلی گھر سے باہر نکل آئے اور عجائب روم کی طرف چل پڑے ایسے میں پروفیسر داؤد نے کہا۔

"جمشید! وہ تینوں بٹن میری سمجھ میں نہیں آئے۔" ان کا لہجہ عجیب تھا۔

"یہ بات تو آپ نے الیکٹریشن کے سامنے بھی کہی تھی۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! اور اس نے ان تینوں بٹنوں کے بارے میں بتا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود میرا اطمینان نہیں ہو سکا۔ ہمیں کسی ماہر الیکٹریشن کو بلا کر سارے بجلی گھر کے نظام کو چیک کرا لینا چاہیے۔"

"لیکن پروفیسر صاحب۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے۔ آیئے پہلے ہم

عجائب روم میں چلیں، پھر کانفرنس روم کا جائزہ لیں گے۔ اگر آپ زیادہ فکر مند ہیں تو تقریب کے وقت ہم میں سے چند آدمی بجلی گھر کے اندر موجود رہیں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

وہ عجائب گھر میں داخل ہوئے تو وہاں فاروق اور آصف کے سوا سب پہنچ چکے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا:

"ارے یہ دونوں کہاں رہ گئے۔"

☆☆

فاروق اور آصف نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد چاروں طرف نظریں گھمائیں اور پھر فاروق کے منہ سے نکلا۔

"ارے! یہ ہیڈ ویٹر صاحب کہاں چلے گئے۔"

"کھانے پینے کی چیزوں کا جائزہ لینے گئے ہوں گے اور کہاں جائیں گے۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"تو اس میں منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" فاروق نے بھی منہ بنایا۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم ہیڈ ویٹر سے یہ بات کس طرح پوچھیں کہ اس کے گھر کے فون کی گھنٹی بج رہی ہے، لیکن ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا، آخر ایسا کیوں ہے۔"

"کیوں نہ ہم ساتھ والے گھر کے نمبر ڈائل کر کے دیکھیں۔ ایک نمبر کم یا زیادہ پر فون کر کے یہ تجربہ کیا جا سکتا ہے۔" فاروق نے تجویز پیش کی۔

"ترکیب اچھی ہے۔ فوراً فون کرو!" آصف نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

"بہت اچھا جناب۔" فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا اور فون پر نم

گھمانے لگا۔ جلدی سلسلہ مل گیا اور دوسری طرف ایک بوڑھی سی آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔ میں خان عباس احمد خان بول رہا ہوں۔"

"جناب خان عباس احمد۔ آپ کے پڑوسی کے گھر میں تو خیریت ہے نا۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"میرے پڑوسی کے گھر میں۔ کیا مطلب، کون سے پڑوسی کے گھر میں۔ میرے اردگرد تو نہ جانے کتنے پڑوسی ہیں۔"

"۳۶۴۵۴ کیا آپ کے ساتھ والے گھر کا فون نمبر نہیں ہے؟"

"یہ نمبر چند گھر چھوڑ کر ایک گھر کا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہم نے اس گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ بار بار کیے، گھنٹی بجتی ہے، لیکن ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا، مہربانی فرما کر ذرا اطمینان تو کر لیں کہ سب خیریت تو ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ انتظار کریں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور ریسیور میز پر رکھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ریسیور اٹھانے کی آواز آئی اور خان صاحب بولے۔

"اس گھر کے دروازے پر تالا لگا ہے، شاید یہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"شکریہ جناب، کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس گھر میں وہی صاحب رہتے ہیں نا جو کانفرنس ہال میں ملازم ہیں۔"

"ہاں۔ بالکل وہی رہتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب! ہم نے آپ کو بہت زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور ریسیور رکھ دیا گیا۔

"لو بھئی۔ ہیڈ بیرا صاحب رہتے تو اسی گھر میں ہیں، البتہ ان کے گھر

والے کہیں گئے ہوئے ہیں، گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ لیکن یہ بات ہیڈ بیرا صاحب نے ہمیں کیوں نہیں بتائی۔"

"ہم اس سے یہ ضرور پوچھیں گے، لیکن پہلے ہمیں عجائب روم چل کر رپورٹ دینی چاہیے۔ وہاں سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے، کیونکہ ہم نے دوسروں کی نسبت زیادہ دیر لگا دی ہے۔" آصف بولا۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

اور جب وہ عجائب روم میں داخل ہوئے۔ سب ان کے انتظار میں دروازے کی طرف منہ کیے کھڑے تھے، انہیں دیکھ کر ان سب کے چہروں پر غصہ دوڑ گیا۔

☆☆☆

تین لاشیں

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر پوچھا۔

"ہم آ تو گئے تھے پہلے ہی، لیکن یہاں اس وقت تک کوئی نہیں آیا تھا، اس وقت ہمیں ایک بات سوجھ گئی اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں پھر گھر سے نکلنا پڑا۔" آصف نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"اچھا اب وقت ضائع نہ کرو۔ سب سے پہلے تم ہی رپورٹ پیش کرو۔"

"جی بہتر!" یہ کہہ کر فاروق نے اپنی کارگزاری کا حال کہہ سنایا۔

"گویا ہیڈ بیرے کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہے، خیر میں ابھی معلوم کرائے لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے اکرام کو فون کیا، ہیڈ بیرے کے گھر کا نمبر اسے بتاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"فوراً اس گھر میں داخل ہونے کا بندوبست کرو، اندر کا جائزہ لے کر مجھے فون کرو کہ وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا۔ انسپکٹر جمشید ریسیور رکھ کر محمود اور آفتاب کی طرف مڑے۔

"تم نے کیا تیر مارا؟"

"انچارج کی میز کے ایک کونے پر ایک سرخ بلب اور ایک بٹن لگا ہے۔

کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت میں وہ بٹن دبے گا اور اس طرح باقی لوگ اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اس چیز کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"ہوں! افرزانہ اور فرحت تم بتاؤ۔"

"ہم نے کیپٹن سے ملاقات کی تھی، وہاں تو کوئی خاص بات نظر نہ آ سکی، پھر کچھ سوچ کر ہم گیٹ کیپر کے پاس گئیں، وہ ایک لمبے قد کا آدمی ہے۔ ہم نے یہ خاص بات معلوم کی ہے کہ اس کی وردی ٹخنوں سے اوپر تک ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے، کیا درزی نے اس کا ناپ غلط لیا تھا، یا اس نے وردی ٹخنوں سے اوپر بنوائی ہے۔ جب کہ کسی اور کی وردی ہم نے ٹخنوں سے اوپر نہیں دیکھی۔"

"خوب! تم نے ایک خاص بات معلوم کی ہے۔ ہم اس پر غور کریں گے اور تفتیش کو آگے بڑھائیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ کی کیا رپورٹ ہے؟" انسپکٹر جمشید نے ان سے پوچھا۔

"مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نوٹی فوبیا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بیماری کا نام سن کر حیرت ظاہر نہیں کی۔ جب کہ خود میں نے بھی اس بیماری کا نام زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی زبان سے ادا کیا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سب چونکے۔

"مطلب یہ کہ نوٹی فوبیا نام کی کسی بیماری کا نام و نشان نہیں، اگر وہ ڈاکٹر صحیح معنوں میں ڈاکٹر ہوتا تو فوراً یہ کہتا کہ نہیں جناب۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس نام کی تو کوئی بیماری نہیں ہے۔ لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے پٹی کرنے کا انداز بھی بالکل اناڑیوں جیسا تھا۔ ایک ڈاکٹر اس طرح پٹی نہیں کرتا۔ لہٰذا میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر نقلی ڈاکٹر ہے۔"

"ویری گڈ۔ یہ بہت خاص بات معلوم ہوئی۔ ہمیں فوری طور پر ڈاکٹر کی نگرانی پر کسی کو مقرر کر دینا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جسے پسند فرمائیں۔ وہی چلا جائے۔" محمود نے کہا۔

"تب پھر تم اور آفتاب ہی جاؤ۔ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھو، سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہو اور اس بات کی بھی پروا نہ کرو کہ اسے اس نگرانی کی خبر ہو جاتی ہے۔ خبر ہوتی ہے تو ہو جائے، پروا نہیں۔"

"بہت بہتر، لیکن جانے سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بجلی گھر میں کیا رہا۔" محمود نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"وہاں۔ دو باتیں عجیب محسوس ہوئیں، نمبر ایک تو یہ کہ الیکٹریشن نے تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی ہے جب کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، دوسرے یہ کہ پروفیسر داؤد کو بجلی کے آلات میں تین بٹن عجیب نظر آئے ہیں اور اب ہم سب کانفرنس روم میں جائیں گے۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ایک منٹ ابا جان۔ آپ نے ڈاکٹر کی نگرانی پر تو محمود اور آفتاب کو مقرر کر دیا، لیکن گیٹ کیپر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، جب کہ وہ بھی شک کی زد میں آ چکا ہے، دوسرے یہ کہ ہیڈ بیرا ابھی غائب ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ تو پھر تم اور آصف اس کی نگرانی کے لیے چلے جاؤ۔ ضرورت پڑی تو ہم تمہیں بلا لیں گے، ہیڈ بیرا کو بھی تلاش کیا جائے گا۔"

"جی بہت بہتر!" فاروق نے کہا۔

"کانفرنس روم کی چھان بین کے بعد کیا پروگرام ہے جمشید۔" خان رحمان نے پوچھا۔

"پوری عمارت کا ایک ایک کمرہ کھنگالا جائے گا۔ دراصل میں خوف زدہ

ہوں کہ کہیں اس عمارت میں ڈائنامائٹ نہ لگا دیے گئے ہوں۔"

"یا اللہ رحم۔" ان میں سے کسی کے منہ سے نکلا پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل کر کانفرنس روم کی طرف چل پڑے محمود اور آفتاب نے ڈاکٹر کے کمرے کا اور فاروق اور آصف نے گیٹ کا رخ کیا۔

کانفرنس روم دیکھ کر وہ بھونچکے رہ گئے۔ یہ ایک عظیم الشان کمرہ تھا۔ انڈے کی طرح گولائی میں تھا، اس کے مطابق چاروں طرف گولائی میں میز نصب کی گئی تھی۔ چاروں طرف کرسیاں موجود تھیں۔ ہر کرسی کے سامنے میز پر مائیک نصب تھا، پورے ہال میں ننھے ننھے لاؤڈ سپیکر نصب تھے۔

"یہاں ہمارے ساتھ ایک الیکٹریشن ہونا چاہیے تھا۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"الیکٹریشن کی ضرورت پر آپ پہلے بھی زور دے چکے ہیں۔ کہیے تو فون کر کے بلوا لوں۔ یا پھر آئی جی صاحب سے کہہ کر انتظام کروا لیا جائے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا، فون کرنے کی صورت میں بھی اس کے واسطے کے لیے آئی جی صاحب سے کہنا پڑے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اچھی بات ہے۔ خان رحمان یہ کام تم کرو۔ شیخ صاحب سے کہہ کر واپس یہیں آ جانا۔"

"اچھا!" انہوں نے کہا اور باہر کی طرف چلے گئے۔

انہوں نے ایک ایک چیز کی چیکنگ شروع کر دی۔

"نہ جانے کیوں۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔" فرحت بولی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم موت کے شکنجے میں کس دیے گئے ہوں۔"

فرزانہ کا چہرہ نہ جانے کیوں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"بھئی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ کام بھی کرتی رہو۔ تم دونوں میز اور کرسیوں کے نچلے حصوں کا جائزہ لے ڈالو، فرش اور قالین کے ایک ایک انچ کو ٹٹول ڈالو۔ ہم دیواروں، الماریوں اور غسل خانوں وغیرہ کا جائزہ لیتے ہیں۔"

انہوں نے اپنا کام تیزی سے شروع کیا۔ فرزانہ اور فرحت کا کام ان کی نسبت مشکل تھا۔ انہیں میز اور کرسیوں کے نیچے ہی سفر کرنا تھا۔ تاہم اس وقت انہیں آسان اور مشکل سے غرض نہیں تھی، انہیں تو جلد از جلد کامیابی حاصل کرنا تھی۔ ابھی انہیں تلاشی شروع کیے تھوڑی دیر گزری تھی کہ فاروق اور آصف اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"کیوں بھئی خیر تو ہے؟" انسپکٹر جمشید انہیں دیکھتے ہی بولے۔ انہوں نے سب پر ایک نظر ڈالی اور پھر چونک کر بولے۔

"ارے۔ یہ فرزانہ اور فرحت کہاں چلی گئیں؟"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔" نیچے سے فرزانہ نے گنگنا کر کہا۔

"بھئی واہ۔ ایسے میں بھی شاعری سوجھ سکتی ہے ان لوگوں کو۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

"فاروق۔ تم نے بتایا نہیں ہے۔ تم تو گیٹ کیپر کی نگرانی کے لیے گئے تھے۔"

"جی ہاں۔ اسی لیے یہاں آ گئے ہیں، گیٹ کیپر غائب ہے۔"

"غائب ہے۔ کیا مطلب؟" وہ سب چونکے۔

"اس کا کوئی پتا نہیں۔ ہم نے ادھر ادھر بھی دیکھ لیا ہے اور اس کے بعد اس کی گم شدگی کی اطلاع شیخ صاحب کو بھی دے دی ہے، چنانچہ انہوں نے فوری طور پر وہاں دو دفتری آفیسر مقرر کر دیے ہیں۔ ہیڈ بیرا ابھی تک کہیں نظر نہیں آیا۔"

"اوہ۔ تب تو یہ بات بالکل ثابت ہے کہ عمارت میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔ ابھی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ محمود اور آفتاب بھی اندر داخل آتے نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا:

"تو کیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی غائب ہیں۔"

"جی۔ جی ہاں۔ لیکن آپ نے یہ کیسے جان لیا؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس طرح کہ گیٹ کیپر بھی غائب ہے۔"

"اوہ!" وہ چونکے۔

اسی وقت آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر زلزلے کے آثار تھے۔

☆☆

سب کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ تاہم فرحت اور فرزانہ بدستور نیچے کام میں لگی رہیں۔

"خیریت تو ہے سر!" انسپکٹر جمشید نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"گیٹ کیپر، ہیڈ بیرا اور ڈاکٹر کی لاشیں ایک کمرے میں پڑی ملی ہیں۔"

آئی جی صاحب کی آواز میں بلا کی لرزش تھی۔

"اف خدا۔ یہ اس عمارت میں کیا ہو رہا ہے۔"

"حالات حد درجے خوفناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ کاش یہاں کانفرنس کا پروگرام ملتوی کر دیا جاتا۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"اگر جلوس روانہ نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا۔ اب یہ ملک کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے۔ مہمانوں کے جلوس کو واپس کس طرح لوٹایا جا سکتا ہے، استقبال کرنے والوں میں پوری دنیا کے اخباری رپورٹر بھی موجود ہیں۔" شیخ صاحب بولے۔

"خیر۔ جو اللہ کو منظور۔ سب لوگ یہاں کام جاری رکھیں، صرف میں اور کامران مرزا صاحب لاشوں کا معائنہ کرتے ہیں، محمود اب تم لوگ بھی یہیں کام شروع کر دو۔"

"جی بہتر!" محمود کے منہ سے نکلا۔

دونوں شیخ صاحب اور خان صاحب کے ساتھ ہال سے نکلے اور ایک سمت میں چل پڑے۔

"لاشوں کے بارے میں کس طرح معلوم ہوا۔"

"ایک بیرے نے آ کر اطلاع دی تھی۔" انہوں نے بتایا۔

"وہ بیرا کہاں ہے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"بیرے کو لاشوں والے کمرے میں ہی روک کر رکھا گیا ہے، تم فکر نہ کرو، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم سب سے پہلے اس بیرے کے بارے میں پوچھو گے۔" آئی جی صاحب نے پھیکی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ ان حالات میں مسکرانا بھی بہت مشکل کام تھا۔

"شکریہ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔"

آخر وہ لاشوں والے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں تین ملٹری مین موجود تھے، ایک طرف ایک بیرا سہما ہوا کھڑا تھا۔ کمرے کے فرش پر ہیڈ بیرے، ڈاکٹر

اور گیسٹ کیپر کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر کوئی زخم نہیں تھا، نہ گولی کا سوراخ تھا۔ البتہ ان کے جسم نیلے پڑ گئے تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں زہر کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے۔

"زہر دیا گیا ہے۔ شاید کسی سوئی کے ذریعے جسم میں داخل کیا گیا ہوگا۔ آپ ذرا عمارت کے انچارج کو یہاں بلوا لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ آئی جی صاحب نے تین میں سے ایک ملٹری مین سے کہا کہ وہ انچارج کو بلا لائے۔ اس کے جانے کے بعد دونوں بیرے کی طرف مڑے۔

"تم اس کمرے میں کیا کرنے آئے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"جی۔ کچھ بھی نہیں، اس طرف سے باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا، اس کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ملا اور فرش پر پڑے نظر آئے تو ہمیں فکر ہوا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر انہیں بلایا جلایا، لیکن یہ ہوش میں نہ آئے۔ تب میں نے ایک ملٹری مین کو ان کے بارے میں بتایا۔ وہ مجھے لے کر یہاں آ گئے اور پھر ان حضرات کو اطلاع دی گئی۔" بیرا جلدی جلدی بتاتا چلا گیا۔

"کیا تم ان تینوں کو پہچانتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جی جی ہاں۔ یہ ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں اور یہ گیسٹ کیپر صاحب اور یہ ہیڈ بیرا۔" اس نے کہا۔

"انہیں اچھی طرح دیکھو۔ خوب غور سے ان کے حلیوں میں کوئی فرق ت
نہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ان کے چہرے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ہر روز تم

"حالات حد درجے خوفناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ کاش یہاں کانفرنس کا پروگرام ملتوی کر دیا جاتا۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"اگر جلوس روانہ نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا۔ اب یہ ملک کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے۔ مہمانوں کے جلوس کو واپس کس طرح لوٹایا جا سکتا ہے، استقبال کرنے والوں میں پوری دنیا کے اخباری رپورٹر بھی موجود ہیں۔" شیخ صاحب بولے۔

"خیر۔ جو اللہ کو منظور۔ سب لوگ یہاں کام جاری رکھیں، صرف میں اور کامران مرزا صاحب لاشوں کا معائنہ کرتے ہیں، محمود اب تم لوگ بھی یہیں کام شروع کردو۔"

"جی بہتر!" محمود کے منہ سے نکلا۔

دونوں شیخ صاحب اور خان صاحب کے ساتھ ہال سے نکلے اور ایک سمت میں چل پڑے۔

"لاشوں کے بارے میں کس طرح معلوم ہوا۔"

"ایک بیرے نے آ کر اطلاع دی تھی۔" انہوں نے بتایا۔

"وہ بیرا کہاں ہے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"بیرے کو لاشوں والے کمرے میں ہی روک کر رکھا گیا ہے، تم فکر نہ کرو، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم سب سے پہلے اس بیرے کے بارے میں پوچھو گے۔" آئی جی صاحب نے پھیکی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ ان حالات میں مسکرانا بھی بہت مشکل کام تھا۔

"شکریہ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔"

آخر وہ لاشوں والے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں تین ملٹری مین موجود تھے، ایک طرف ایک بیرا سہما ہوا کھڑا تھا۔ کمرے کے فرش پر ہیڈ بیرے، ڈاکٹر

اور گیٹ کیپر کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر کوئی زخم نہیں تھا، نہ گولی کا سوراخ تھا۔ البتہ ان کے جسم نیلے پڑ گئے تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں زہر کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے۔

"زہر دیا گیا ہے۔ شاید کسی سوئی کے ذریعے جسم میں داخل کیا گیا ہوگا۔ آپ ذرا عمارت کے انچارج کو یہاں بلوا لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ آئی جی صاحب نے تین میں سے ایک ملٹری مین سے کہا کہ وہ انچارج کو بلا لائے۔ اس کے جانے کے بعد دونوں بیرے کی طرف مڑے۔

"تم اس کمرے میں کیا کرنے آئے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"جی۔ کچھ بھی نہیں، اس طرف سے باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا، اس کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ملا اور فرش پر پڑے نظر آئے تو ہمیں فکر ہوا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر انہیں بلایا جلایا، لیکن یہ ہوش میں نہ آئے۔ تب میں نے ایک ملٹری مین کو ان کے بارے میں بتایا۔ وہ مجھے لے کر یہاں آ گئے اور پھر ان حضرات کو اطلاع دی گئی۔" بیرا جلدی جلدی بتاتا چلا گیا۔

"کیا تم ان تینوں کو پہچانتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جی جی ہاں۔ یہ ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں اور یہ گیٹ کیپر صاحب اور یہ ہیڈ بیرا۔" اس نے کہا۔

"انہیں اچھی طرح دیکھو۔ خوب غور سے ان کے حلیوں میں کوئی فرق تو نہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ان کے چہرے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ہر روز تم لوگ

دیکھتے رہے ہو یا ان میں آج کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے۔"

اس نے حیرت بھرے انداز میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور پھر

ایک بولا۔

"مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا، یہی چہرے ہم دیکھتے رہے ہیں۔ ہو بہو

بھی۔"

"اچھا گیٹ کیپر کے پیروں کی طرف دیکھو۔ اس کی پتلون ٹخنوں سے اوپر

ہے، کیا یہ ہمیشہ اتنی ہی اونچی پتلون پہنتا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ان کی یہ بات سن کر اس نے فوراً اس کے پیروں کے آس پاس دیکھا اور

حیران ہو کر کہا۔

"جی نہیں۔ ٹخنے تو میں نے ان کے کبھی ننگے نہیں دیکھے۔"

"اچھا ٹھہرو۔ میں ایک تجربہ اور کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا

آگے بڑھے۔ انسپکٹر جمشید بھی ان کا مطلب سمجھ کر آگے بڑھے، دونوں نے گیٹ کیپر

کی لاش کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"اب دیکھو۔ کیا گیٹ کیپر کا قد پہلے جتنا ہی ہے۔"

اس نے حیرت بھری نظروں سے گیٹ کیپر کے قد کا جائزہ لیا اور پھر

قدرے ایک سراسراہٹ زدہ انداز میں بولا۔

"ارے ان کا قد اتنا لمبا کس طرح ہو گیا۔"

"بس ہمیں یہی معلوم کرنا تھا۔ لیکن تم ابھی یہیں رہو گے، کیونکہ تمہارے

باہر جانے کے بعد تین لاشیں ملنے کی خبر چھپی نہیں رہ سکتی اور اس طرح سراسیمگی پھیلے

گی۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے لاش کو اسی حالت میں لٹا دیا۔

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی اور ملٹری مین انچارج کے ساتھ اندر

داخل ہوا۔ جونہی اس کی نظریں لاشوں پر پڑیں، وہ بوکھلا اٹھا۔

"ارے باپ رے۔ یہ کیا ہوا۔"

ان تینوں کو ہلاک کیا گیا ہے۔ آپ اس عمارت کے انچارج ہیں، یہ آپ

کی ماتحتی میں کام کرتے تھے نا۔"

"جی ہاں! لیکن انہیں کس نے ہلاک کیا اور کیوں؟"

"ہمیں خود معلوم نہیں۔ لیکن جلد معلوم کر لیں گے۔ آپ ذرا گیٹ کیپر کو

دیکھیے۔ کیا یہ اصلی گیٹ کیپر ہے۔"

"جی کیا مطلب؟"

اس ہیرے کا خیال ہے کہ گیٹ کیپر کا قد بہت لمبا ہو گیا ہے۔ یعنی یہ اتنے

لمبے قد کا نہیں تھا۔"

"مم۔ میں سمجھا نہیں۔"

"بات یوں آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید گیٹ کیپر

اور ڈاکٹر کی لاشوں کے چہروں کے پاس بیٹھ گئے اور ان کے چہروں کو ٹٹولنے لگے اور

پھر چند منٹ کی کوشش کے بعد انہوں نے انسانی جلد سے ملتے جلتے پلاسٹک کے چند

ٹکڑے ان کے چہروں پر سے نوچ پھینکے۔ دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔

"ہیڈ ہیرا، ڈاکٹر اور گیٹ کیپر کی جگہ اب تین بالکل نئے چہرے ان کی

آنکھوں کے سامنے تھے۔

☆☆☆

مہمان آتے ہیں

''اب آپ کیا کہتے ہیں انچارج صاحب۔'' انسپکٹر کامران مرزا انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''ہم نے آپ سے کہا تھا نا، عمارت میں کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ اب ثبوت بھی مل گیا ہے، لیکن ابھی تک ہم یہ نہیں جان سکے کہ گڑبڑ کہاں ہے۔ تاہم ہمیں امید ہے۔ کانفرنس شروع ہونے سے پہلے پہلے ہم یہ بھی معلوم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ نقلی ڈاکٹرز اور نقلی گیٹ کیپر کہاں سے آگئے، اصل کہاں چلے گئے۔'' انسپکٹر جمشید جلدی جلدی کہتے چلے گئے، عین اس وقت کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ آئی جی صاحب نے جلدی سے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپریٹر کو بتا کر آیا تھا کہ ہم اس کمرے میں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ فون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چند سیکنڈ تک دوسری طرف کی گفتگو سنتے رہے اور پھر انہوں نے س طرح ریسیور رکھا جیسے ان کے ہاتھ میں جان نہ رہ گئی ہو۔

''خدایا رحم فرما۔''

''اب کیا ہوا سر!'' انسپکٹر جمشید بوکھلا کر بولے۔

''تم نے اکرام کے ذمے کوئی کام لگایا تھا؟'' وہ بولے۔

''جی ہاں، اسے ہیڈ بیرے کے گھر جا کر تفتیش کرنا تھی۔''

''فون اسی کا تھا اور ہیڈ بیرے کے گھر سے ہی کیا گیا تھا۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ ہیڈ بیرا اور اس کے گھر والے گھر کے ایک کمرے میں رسیوں سے بری طرح جکڑے ملے ہیں۔ ان کے منہ پر ٹیپ لگا دی گئی ہے۔ بس وہ صرف سانس لینے کے قابل رہے ہیں۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل جل سکتے۔ وہ دو دن سے وہاں بند پڑے تھے۔''

حالات بہت نازک صورت اختیار کر چکے ہیں، ہمیں باقی ملازمین کے گھروں کو بھی چیک کرانا ہوگا، یہ کام آپ اکرام کے ذمے لگائیں۔

''میں اور کامران مرزا واپس کانفرنس روم میں جاتے ہیں۔ آپ برابر ہم سے رابطہ قائم رکھیں۔ خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ہم ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا سکے۔''

''انچارج صاحب کا کیا کرنا ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہم انہیں ساتھ لے جارہے ہیں۔ کیا خبر کب ان سے کوئی بات پوچھنے کی ضرورت پڑ جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا اور وہ کانفرنس روم کی طرف چل پڑے۔

اندر داخل ہوئے تو سب لوگوں کے چہروں پر انہوں نے ناکامی کے آثار صاف دیکھے۔ گویا وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔

''بھئی اس طرح چہرے لٹکانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کام کرو کام۔ ہاتھ پیر ہلانے کے ساتھ عقل بھی استعمال کرتے رہو۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

ان کی مسکراہٹ نے انہیں بہت سہارا دیا۔ فاروق نے شوخ آواز میں

پوچھا۔ "... وہاں کی کیا خبر ہے۔"

"تو جناب انچارج سے آپ آ رہے ہیں ...

ڈاکٹر، بطیدہ اور گیٹ کیپر نقلی ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے چہروں پر پلاسٹک میک اپ انچارج عمارت سے کیا گیا تھا۔ تاہم گیٹ کیپر کی جگہ جس آدمی کو بٹھایا گیا، اس کا قد گیٹ کیپر کی نسبت بڑا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے ٹخنے نظر آرہے تھے۔"

"اوہ۔" ان سب کے منہ سے نکلا۔ پھر ان کی نظریں انچارج پر جم گئیں۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا ان نظروں کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ انسپکٹر جمشید نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

"انچارج صاحب کو ہم اپنی مدد کے لیے ساتھ لے آئے ہیں۔"

"یہ۔ یہ آپ نے اچھا کیا۔" محمود نے جلدی سے کہا، ورنہ کہنا وہ یہ چاہتا تھا کہ کہیں انچارج صاحب بھی تو نقلی نہیں ہیں۔

پورے ہال کی تلاشی میں بہت وقت لگ گیا، لیکن وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکے، کہیں کوئی گڑبڑ نہ پا سکے۔ آخر مایوس ہو کر انہوں نے باہر نکلنے کی ٹھانی۔ لیکن اس سے پہلے انسپکٹر جمشید نے انچارج سے کہا:

"اس ہال کے نیچے کیا ہے؟"

"جی۔ نیچے۔ کیا مطلب؟"

"اس کے نیچے کوئی اور کمرہ تو نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔ اس کے نیچے کنکریٹ کی تہیں بچھائی گئی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس عمارت کے نیچے کوئی تہہ خانہ وغیرہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"شکریہ! میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔" انہوں نے کہا اور باہر جانے کے

لیے مڑے۔ اس وقت اس کی نظر پروفیسر داؤد پر پڑی، وہ ایک مائیک پر جھکے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔

"خیر تو ہے پروفیسر صاحب۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"کچھ نہیں۔ میں ذرا یہ مائیک کھول کر دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے اور تو ہر طرح اس ہال کو دیکھ ڈالا ہے۔ ان مائیکوں کو نہیں دیکھا۔"

"اوہ واقعی۔ خیال تو اچھا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا خوش ہو کر بولے۔

وہ سب پروفیسر داؤد کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ مائیک کا اوپر والا ڈھکنا اتار رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھکنا ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ انہوں نے مائیک کے اندرونی حصے میں دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے ڈھکنا چڑھانے لگے۔

"نہیں جمشید۔ یہاں بھی کچھ نہیں ہے۔"

"آیئے پھر چلیں۔" انہوں نے کہا اور دروازے کی طرف مڑے۔ اس وقت ان کی نظر فرزانہ پر پڑی۔ فرزانہ کی آنکھوں میں حیرت کے دیے روشن تھے اور اس کے چہرے پر جوش کی حالت طاری تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ تاہم خاموش رہے اور باہر کی طرف چل پڑے۔

☆☆

اب انہیں باقی عمارت کو کھنگالنا تھا اور یہ ایک بہت لمبا کام تھا، اس میں بہت وقت ضائع ہوتا، لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے انہوں نے فرزانہ کو بازو سے پکڑا اور رفتار آہستہ کرتے ہوئے سب سے پیچھے آ گئے۔

"ہاں فرزانہ۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟" انہوں نے سرگوشی کی۔

"پروفیسر انکل جب مائیک کو کھول رہے تھے تو میں نے انچارج کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا تھا اور جب انہوں نے یہ کہا کہ نہیں۔ اس میں بھی کچھ نہیں

ہے تو اس کا چہرہ معمول پر آ گیا۔"

"اوہ" انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔ انہوں نے اپنے آگے دیکھا پروفیسر داؤد زیادہ آگے نہیں تھے، انہوں نے چند لمبے قدم اٹھائے اور ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ پھر انہیں بازو سے پکڑ کر پیچھے لے آئے:

"کیا آپ نے مائیک کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔" انہوں نے دبی آواز میں کہا۔

"ہاں کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"میرا خیال ہے۔ آپ چند مائیکوں کو کھول کر بغور دیکھ لیں۔"

"کیوں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے۔ جب آپ مائیک کا ڈھکنا اُتار رہے تھے تو فرزانہ نے انچارج کا رنگ اڑتے دیکھا تھا، لیکن جب آپ نے یہ کہا کہ نہیں۔ اس مائیک میں بھی کچھ نہیں ہے تو اس کا اطمینان لوٹ آیا۔"

"اوہ۔ تو تم یہ چاہتے ہو، میں خاموشی سے واپس پلٹ جاؤں اور ہال میں لگے مائیکوں کا بغور جائزہ لوں۔"

"ہاں۔ فرزانہ کو ساتھ لے جائیے۔ گیٹ پر کھڑے ملٹری آفیسر آپ کو نہیں روکیں گے۔ کیونکہ ابھی ابھی ہمیں تلاشی لیتے دیکھ چکے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ تم ہمیں کہاں ملو گے۔"

"میں آپ کو عجائب روم میں ملوں گا۔ پہلے ہم وہیں جا رہے ہیں اور اس کے بعد ڈاکٹر اور ہیڈ بیرا کے کمرے میں جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ باقی لوگ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ برآمدے کا موڑ مڑ گئے۔ ان کے مڑتے ہی فرزانہ اور

پروفیسر داؤد واپس کانفرنس روم کی طرف مڑے۔

دروازے پر موجود ملٹری آفیسر نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا، لیکن بولے کچھ نہیں، آئی جی صاحب ان لوگوں کے بارے میں پہلے ہی ہدایات دے چکے تھے۔

پروفیسر داؤد ایک دوسرے مائیک کو کھولنے لگے، کھولنے کے بعد اس کے اندر دیکھا۔ چند سیکنڈ تک بغور دیکھتے رہے، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے:

"نہیں۔ فرزانہ۔ کچھ نہیں ہے۔"

"کیا اسے اور اندر سے نہیں کھولا جا سکتا۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"تو پھر کھول کر دیکھ لیجیے۔"

"اچھی بات ہے۔"

انہوں نے کہا اور مائیک کا اندرونی حصہ کھولنے لگے اور پھر فرزانہ نے ان کے ہاتھوں میں تھرتھراہٹ دیکھی۔ ان کے چہرے کا رنگ یک دم سیاہ پڑ گیا۔ فرزانہ کو یاد آیا، انہوں نے اپنے والد کا چہرہ بھی اسی طرح جہاز میں سیاہ پڑتے دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بھی اڑ گیا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"خیر تو ہے انکل؟"

"ایک منٹ۔" پروفیسر کے منہ سے نکلا اور وہ دوسرے مائیک پر مصروف ہو گئے۔ پھر دونوں کو پہلی حالت میں لانے کے بعد انہوں نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"چلو فرزانہ۔ اس کمرے میں ہولناک موت منڈلا رہی ہے۔"

عین اسی وقت انہوں نے فوجی بینڈ کی آواز سنی۔ گویا جلوس عمارت تک

پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

ہولناک جنگ

ان کے رنگ اُڑ گئے، دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اب ان کے پاس صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر انہیں خطرے کو دور کرنا تھا اور یہ بات ابھی صرف پروفیسر داؤد کو معلوم تھی کہ خطرہ کیا ہے، چنانچہ فرزانہ نے جلدی سے کہا:

”آیئے انکل۔ باقی لوگوں کو فوراً اطلاع دیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے، چلو۔“ انہوں نے کہا اور دونوں باہر نکل کر تیزی سے عجائب روم کی طرف بڑھے۔ باقی سب لوگ انہیں عجائب روم میں ہی مل گئے۔ ان کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے۔

”معلوم ہوتا ہے، آپ نے کچھ معلوم کر لیا ہے۔“ انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

”ہاں جمشید۔ کانفرنس روم کے ہر مائیک میں ایک ہولناک موت موجود ہے، جونہی مائیک چالو کیے جائیں گے، بیک وقت تمام کے تمام پھٹ پڑیں گے۔ اور سامنے والوں کے چہرے اڑ جائیں گے ہم ان کے صرف دھڑ دیکھ سکیں گے۔ چہرے نام کی کوئی چیز کسی مہمان کے دھڑ پر نہیں رہ جائے گی۔ ہر مائیک میں ایک ننھا سا الیکٹرونک بم موجود ہے۔“

"اور مائیک الیکٹریشن روم سے چالو کیے جائیں گے۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"اور الیکٹریشن روم میں تین عجیب و غریب بٹن موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر پروفیسر انکل پہلے ہی چونک گئے تھے۔" محمود نے جلدی سے کہا، ساتھ ہی اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور انچارج کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ اس کے الفاظ سنتے ہی بھاگ نکلا تھا اور اگر محمود فوراً ہی نہ دوڑ پڑتا تو وہ کمرے سے نکل گیا تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ الیکٹریشن کے پاس جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فوراً ہی انسپکٹر کامران مرزا حرکت میں آئے اور اس سے پہلے کہ انچارج اٹھ کر بھاگ سکتا، انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ جلد ہی وہ بے بس ہو گیا۔

"اب ہمیں ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر بجلی گھر میں داخل ہو جانا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا ہم پہلے شیخ صاحب کو اطلاع نہ دیں۔"

"وقت بہت کم ہے۔ یوں بھی شیخ صاحب وغیرہ اس وقت استقبال کے لیے باہر نکل چکے ہوں گے، آؤ جلدی کرو۔"

اور وہ سب بجلی گھر کی طرف چلے، انچارج کو انسپکٹر کامران مرزا اور ملٹری مین نے قابو میں کر رکھا تھا، بجلی گھر کا دروازہ انہیں کھلا ملا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ وہی ٹھگنا سا الیکٹریشن اپنی میز کے پاس بیٹھا تھا۔ انہیں ایک ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر چونک اٹھا اور پھر بے اختیار اس نے اپنی میز کے کونے پر لگے بٹن کو دبا دیا۔

"تم اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت بہتر! یہ لیجیے۔ لیکن میرے دوست۔ تم ناکام ہو چکے ہو۔" اس نے

مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ہاں! اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمام مہمانوں کی موت یوں سمجھو لکھی جا چکی ہے۔ تم چاہتے ہوئے بھی انہیں نہیں بچا سکو گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم جان چکے ہیں کہ ہر مائیک میں ایک ننھا سا بم پوشیدہ ہے۔ تمام مائیک ایک ساتھ پھٹیں گے۔ لہٰذا اب ہم مہمانوں کو مائیکوں کے سامنے بیٹھنے کی اجازت کس طرح دے سکتے ہیں۔ اب یہ کانفرنس کسی اور کمرے میں ہو جائے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔ میرا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے، میں پہلے ہی ہر امکان کا جائزہ لے لیا کرتا ہوں۔" اس بار اس کی آواز سن کر وہ اچھل پڑے۔ یہ باس کی آواز تھی جو وہ سنتے رہے تھے۔

"ارے۔ یہ تو اپنے باس کی آواز ہے، وہی شیریں آواز جو ہم غار میں سنتے رہے ہیں، وادی میں سنتے رہے ہیں اور ریت کے اس میدان میں سنتے رہے ہیں۔" فاروق خوش ہو کر کہا۔

"فاروق اپنی زبان بند رکھو۔ وقت انتہائی نازک ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"جی۔ جی بہتر!" اس نے سہم کر کہا۔

"ہاں۔ ہم سمجھے نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے باس سے کہا۔

"صرف یہ کہ تم پوری طرح بے بس ہو۔ اور مہمانوں کو موت سے کسی طرح نہیں بچا سکتے۔ تم لوگوں کو غار میں قید کرنے کے باوجود میں نے اس امکان کو نظر انداز

نہیں کیا تھا کہ تم نکل بھی سکتے ہو۔ لہٰذا میں نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ شاید تم غار سے نکل آؤ گے۔ اور یہاں تک پہنچ جاؤ گے۔ میں نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ تم یہ بات بھی شاید بھانپ لو کہ یہاں پورے کا پورا عملہ بدل دیا گیا ہے اور عملے کی بجائے میرے آدمی موجود ہیں۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ پروفیسر داؤد جیسا ماہر سائنس دان ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ مائیکوں میں بموں کی موجودگی محسوس کر لے۔ چنانچہ تم سب لوگ سیدھے دوڑتے بجلی گھر کی طرف آؤ گے۔ جب میں ان تمام امکانات کا پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں نے تمہارا کوئی بندوبست نہ کیا ہو۔ اپنے اردگرد نظر ڈال لو اور پھر اندازہ لگا لو کہ تم کس پوزیشن میں ہو اور میں کس پوزیشن میں یہاں کے کچھ پہریداروں کی جگہ بھی میرے آدمی لے چکے ہیں۔ اور اس وقت بجلی گھر کے اردگرد وہی پہرے موجود ہیں۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے ساتھ ہی انہیں مشروبات پیش کیے جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اور سلسلہ شروع ہونے کی دیر ہے کہ کانفرنس روم قتل گاہ بن جائے گا۔'' یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ انہوں نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا، بجلی گھر کی دیواروں میں سے ریوالوروں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔ اور ان سب نالوں کا رُخ ان کی طرف تھا۔ گویا انہیں چشم زدن میں ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے۔

''اب میں بتاؤں۔ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ یہ کہ ہماری زندگیاں جاتی ہیں تو جائیں۔ ہم مہمانوں کو ہلاک نہیں ہونے دیں گے، لیکن مشکل تو یہی ہے کہ تم اپنی جانوں سے ہاتھ دھو کر بھی انہیں نہیں بچا سکو گے۔ کیونکہ تم لوگ کانفرنس روم میں موجود مہمانوں یا استقبال کرنے والوں کو یہ بتا ہی نہیں سکو گے کہ ان کے سروں پر کیا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اب تم لوگ اپنے اپنے پستول پھینک دو۔ تا کہ ہم پُرسکون فضا میں دو دو باتیں کر لیں۔ ابھی تم میرا اصلی چہرہ بھی دیکھنا چاہو گے۔ اور باقی تفصیل بھی

سننے کے لیے بے چین ہو گے۔ میں تمہیں ساری تفصیل ضرور سناؤں گا۔ اس وقت تک مہمان کانفرنس روم میں پہنچ جائیں گے اور مشروبات سے دل بہلانا شروع کر چکے ہوں گے، پھر تمہارے صدر صاحب افتتاحی تقریر کے لیے کھڑے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی مائیک پھٹ پڑیں گے۔ کیوں۔ کتنا شاندار پروگرام ہے۔ ارے۔ تم نے اب تک پستول نہیں پھینکے۔ اگر تم میری باتوں پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیے دیتا ہوں کہ وہ اپنے بے آواز پستولوں سے تم لوگوں کا کام تمام کر دیں۔ باقی رہا میں تو میرا تم بال بھی بیکا نہیں کر سکو گے۔ میں اس وقت ایک ایسے باکس میں ہوں جس کے پاس گولی پھٹکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اگر یقین نہیں تو مجھ پر گولی چلا کر دیکھ لو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بجلی گھر میں گولی چلنے کا دھماکا ہو جائے گا۔ اور کچھ ملٹری والے صورتحال معلوم کرنے ادھر آ جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔ وہ بھی اندر کر تمہاری طرح بے بس ہو جائیں گے۔ آج کا دن ہمارا دن ہے۔ ہماری فتح کا دن ہے۔ میری کامیابیوں کا دن ہے۔ میرے منصوبے کا آج آخری دن ہے۔'' وہ پُر جوش انداز میں کہتا چلا گیا۔

اب انہوں نے مایوس ہو کر پستول جیبوں سے نکالے اور نیچے پھینک دیے۔

''انچارج صاحب۔ تمام پستول اٹھا کر ایک جگہ جمع کر لو۔ بلکہ الماری میں رکھ کر تالا لگا دو۔'' اس نے کہا اور انچارج نے کسی ادنیٰ خادم کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی۔

''اب میرے کچھ وفادار اندر آ جائیں۔ اور انہیں اپنے ریوالوروں کی زد میں لے لیں تا کہ میں اپنے منصوبے کی تفصیل انہیں سنا سکوں۔''

فوراً ہی تقریباً دس آدمی اندر داخل ہوئے اور انہوں نے بجلی گھر کے

دروازے بند کر دیے، پھر انہیں اپنے پستولوں کی زد میں لے لیا۔

''اب باقی لوگ باہر نہ ٹھہریں، پستول سوراخ میں سے ہٹا لیں اور دوسرے پہروں کے ساتھ مل جائیں۔ تاکہ بجلی گھر کے باہر گڑبڑ کے آثار نہ دیکھے جائیں۔''

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ریوالوروں کی نالیں غائب ہو گئیں۔ اب وہ بجلی گھر میں قید ہو چکے تھے۔ چالاک ترین مجرم ایک بار پھر ان پر چھا چکا تھا۔ اس قدر چالاک مجرم سے ان کا واسطہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔

''اب ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ میں تفصیل سنا سکوں اور تم سن سکو۔ کانفرنس روم میں دھماکا ہونے کے ساتھ ہی اس کمرے میں بھی ایک دھماکا ہوگا۔ اور تم لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑو گے۔ میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ تمہیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ ابھی میرے اور تمہارے درمیان کچھ مقابلے اور ہوں گے۔ مجھے تم سے انتقام لینا ہے۔ ہاں تو منصوبے کی ہوش ربا تفصیل سنو۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی، یہ ایک گہری طنز بھری مسکراہٹ تھی۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے، وہ بجلی گھر میں اس طرح کھڑے تھے جیسے مجرم عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر باس کی زہریلی آواز ان کے کانوں میں نشتر کی طرح چبھنے لگی۔

''تقریباً تین سال پہلے مجھے میرے ملک نے حکم دیا تھا کہ تمام اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ایک جگہ جمع کر کے ہلاک کر دیا جائے۔ بغیر کسی وجہ کے تمام اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ایک جگہ جمع کرنا مشکل کام تھا، چنانچہ ملک سیرات پر قبضہ کرنے کا عجیب و غریب پروگرام میں نے ترتیب دیا۔ اپنے ایک نائب کو بے تحاشہ دولت دے کر ملک سیرات میں مشہور کرانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ

حکومت کی مخالف جماعت میں شامل ہو گیا، انتخابات ہوئے تو اسے صدر چن لیا گیا۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میرا اشارہ جوناف کی طرف ہے۔ ہاں۔ جوناف میرا ایک بہت ہی خاص نائب ہے۔'' یہاں تک کہہ کر وہ رک گیا۔

''اُف خدایا۔ یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔'' ان میں سے بیشتر کے منہ سے نکلا۔

''اور یہ اندازہ میں نے جہاز میں ہی لگا لیا تھا جب خدمتگاروں نے ہم پر پستول تانے تھے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''اوہ ہاں۔ آپ کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ آخر کیوں۔ کم از کم اس موقعے پر تو بتا دیجیے۔''

''ہاں ضرور۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ صدر جوناف کے جہاز کے عملے کی جگہ دشمن کے آدمیوں نے لے لی ہے اور یہ لوگ ضرور عملے کے آدمیوں کے میک اپ میں ہیں، لیکن جب میں نے ان لوگوں کے چہروں کو بغور دیکھا تو میک اپ کے آثار نہیں بھی نظر نہیں آئے۔ دوسرے یہ کہ صدر جوناف کی پریشانی بھی سچی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ دیکھ کر ہی میرا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ کیونکہ جہاز کا عملہ میک اپ میں نہیں تھا، تو پھر جو کچھ ہو رہا تھا۔ صدر جوناف کی مرضی سے ہو رہا تھا اور یہ ایک بہت خوفناک بات تھی۔ یعنی صدر جوناف خود ہمیں اغوا کرا رہے تھے۔ اس وقت میں یہ جان گیا تھا کہ وہ ہمیں اغوا کرانے والوں کے ساتھی ہیں اور یہ کہ دشمن ملک کے جاسوس ہیں، یہ اور بات ہے کہ ملک سیرات کے صدر بن بیٹھے ہیں۔''

''ہاں! جوناف کو صدر اسی لیے بنایا گیا تھا کہ سیرات پر فوجیں چڑھا کر اسے محل سے نکال لیا جائے گا، اس طرح سیرات کے صدر کے فرار کی خبر مشہور ہو جائے گی اور فوج اور عوام بددل ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا، لیکن میں نے ایک

تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں جانتا تھا، تمہارے ملک کے خلاف جب بھی کوئی سازش تیار کی گئی۔ تم لوگ آڑے آئے اور تم لوگوں نے سازش کے جال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہی سوچ کر میں نے ایک طرف تو جوناف کو طیارے کے ذریعے محل سے اڑنے کی ہدایت کی، دوسری طرف اسے تمہارے ملک۔ تمہارے صدر کے پاس بھیج دیا، تا کہ وہ ملک کی اندرونی سازشوں کے توڑ کے لیے تم لوگوں کی مدد مانگیں، چنانچہ ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوا۔ انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ کے لیے یہ کیا گیا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک پیکٹ آفتاب، آصف اور فرحت کو بھیجا تھا، ان کی انتہائی خفیہ نگرانی چونکہ پروگرام کی وجہ سے پہلے ہی شروع تھی، اس لیے اس پیکٹ کی خبر مجھے بھی ہو گئی۔ فوراً ہی میں نے مشرقی حصے میں بھی ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ ایک آدمی کے ذریعے ڈاکیے کو لالچ دے کر وہ پیکٹ حاصل کر لیا گیا۔ اس طرح یہ اس پیکٹ کے چکر میں اُلجھ گئے۔ اور انوار شام کی مدد سے میں انہیں اس میدان تک کھینچ لایا، جس کے ایک سرے پر میرا شیشے کی عمارت والا ہیڈ کوارٹر تھا اور دوسری طرف وہ وادی جس میں انسپکٹر جمشید پارٹی کو اُتارا گیا تھا۔"

"لیکن صدر جوناف کے بارے میں تو کہا گیا تھا کہ انہیں اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا۔" اس موقع پر محمود بول پڑا۔

"ہاں! اس وادی میں اندھے کنوئیں کا کوئی نام و نشان نہیں۔ میں اپنے نائب کو تم لوگوں کے ساتھ تو چھوڑ نہیں سکتا تھا، چنانچہ اندھے کنوئیں کا جھوٹ بول دیا گیا۔"

"تو کیا۔ جوناف ہی وہ نائب تھا جو شیشے کی عمارت میں ہم سے ملا تھا۔"

"ہاں! ملک میرات والی ڈیوٹی سے پہلے وہ اسی ہیڈ کوارٹر کا انچارج تھا۔ نچہ مہم سے واپسی پر اس نے آتے ہی پھر چارج سنبھال لیا تھا۔"

"اوہ۔" اُن کے منہ سے نکلا۔

"اسی لیے ہمیں اس کی آواز جانی پہچانی محسوس ہوتی رہی تھی۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ بجلی گھر کے دروازے بند تھے، وہ باس کے آدمیوں کے نرغے میں فرش پر کھڑے تھے، اُن کی طرف تقریباً دس ریوالوروں کی نالیں اٹھی ہوئی تھیں اور باس انہیں اپنے منصوبے کی تفصیل سنا رہا تھا۔ گزرنے والا ہر سیکنڈ صورتحال کو خوفناک ترین بنا رہا تھا اور وہ اس کی باتیں سننے پر مجبور تھے۔ انہوں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں! اسی لیے تم لوگوں کو اس کی آواز جانی پہچانی محسوس ہوتی رہی تھی۔ انسپکٹر جمشید کو میری آواز بھی جانی پہچانی محسوس ہوتی رہی ہو گی۔ ابھی جب میں اپنی اصل آواز بولوں گا تو تم لوگوں کو معلوم ہو جائے گا، میں کون ہوں گا۔"

"تم آواز کو کتنا ہی بدلو۔ میں تمہیں بہت پہلے پہچان چکا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ پہچان چکے ہیں۔" محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! میں نے تم لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی، پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اب جب کہ یہ راز چند لمحوں کے بعد کھلنے والا ہے، میں ہی کیوں نہ تمہیں بتا دوں۔ اس وقت ہم مسٹر سلاٹر سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"کیا!!!" ان کے منہ سے دہشت زدہ انداز میں نکلا۔ اس کے ساتھ ہی سلاٹر نے اپنی آنکھوں سے تاریک شیشوں کی عینک اتار دی، اس کی آنکھیں دیکھتے ہی انہیں جھٹکا سا لگا۔ اس سے گزشتہ ملاقات کا ایک ایک لمحہ ان کی آنکھوں کے سامنے

سے گھوم گیا۔ کس طرح وہ اس کے ہاتھوں پٹے تھے اور ان کے والد سے تو اس کی خوفناک لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں اس نے انسپکٹر جمشید کے پیٹ پر اچھل اچھل کر انہیں بے دم کر دیا تھا۔ یہ تو ان کی عقل تھی جو انہیں بچا گئی تھی۔ اس لڑائی کا خوفناک منظر کسی فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگا۔ انہوں نے اپنے جسموں میں کپکپی کی لہر محسوس کی۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا سلاٹر کا نام سن کر بری طرح چونکے تھے۔ آفتاب، آصف اور فرحت کو تو خیر اس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا سلاٹر کے کارناموں سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن ان کا اس سے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

"تو یہ سلاٹر ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! غار میں جب اس نے ہم سے باتیں کی تھیں تو اپنی بدلی ہوئی آواز پر پوری طرح قابو نہیں رکھ سکا تھا اور اس وقت میں نے یہ جان لیا تھا کہ باس دراصل سلاٹر ہے۔"

"خیر۔ خیر۔ تم نے مجھے پہچان لیا، کوئی بات نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دونوں پارٹیوں کو وادی اور میدان میں اتارا گیا۔ پھر میدان میں یکجا کیا گیا۔ میں دراصل اپنے شکاروں کو بے بسی میں مبتلا کر کے لطف لینے کا عادی ہوں۔ میدان میں جو کچھ ہوا، شیشے کی عمارت میں بیٹھ کر میں اسے دیکھتا رہا۔ وادی میں تم لوگوں نے جو کچھ کیا، وہ بھی میری نظروں کے سامنے رہا، بس چوک تو اس وقت ہوئی جب تم میں سے دو ننھے شیطان چھت پر جا پہنچے، اس وقت میں عمارت میں نہیں تھا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو تم لوگ فرار نہ ہو پاتے۔ خیر۔ میں ہمیشہ ہی اپنے لیے ننانوے فیصد کامیابی کا امکان رکھتا ہوں اور ایک فیصد ناکامی کا امکان بھی میرے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور خاص بات یہ کہ میں اس ایک فیصد کی طرف زیادہ توجہ دیا کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے پہلے ہی

یہ سوچ لیا تھا کہ اگر ایک فیصد ناکامی آڑے آئی تو کیا کیا جائے گا۔ چنانچہ ادھر تم فرار ہوئے، ادھر میں نے تمہارے ملک کے مشرقی حصے میں موجود اپنے آدمیوں کو اشارہ دے دیا۔ پروگرام پہلے سے طے تھا۔ انہوں نے بیگم کامران مرزا، منور علی خان اور محمد یوسف خان کو اغوا کر لیا۔ اور ملک کے مغربی حصے میں پہنچا دیا۔ یہ ننھے منے جہاز ہمارے پورے پروگرام میں ہماری مدد کرتے رہے ہیں تمہارے ملک کے آلات کو ان کا پتا نہیں چلتا اور ہم اپنا کام کر گزرتے ہیں۔ اس وقت بھی تم لوگ یہ سوچ رہے ہو گے کہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہم فرار کس طرح ہوں گے، تو یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔ عمارت کی چھت پر دو ننھے منے جہاز پہلے سے موجود ہیں، ہم ان میں سوار ہو کر فرار ہو جائیں گے۔ بس تقریب شروع ہونے کی دیر ہے اس وقت تک کانفرنس روم میں مہمان داخل ہونے شروع ہو گئے ہوں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک فیصد ناکامی کے آڑے آنے کے بعد میرے منصوبے کا دوسرا حصہ شروع ہوا اور تم لوگ غار میں قید کر دیے گئے، لیکن اس بار بھی میں نے ایک فیصد ناکامی کا امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے۔"

"ایک منٹ مسٹر سلاٹر۔ ہماری ایک الجھن رفع کرتے جائیے۔ ہمیں اس غار میں داخل کس راستے سے کیا گیا، کیونکہ ہم نے غار کے منہ پر پتھر گرنے کی آواز نہیں سنی تھی۔" محمود نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس غار میں داخلے کا ایک خفیہ راستہ اور ہے۔"

"تت۔ تو کیا تم اس راستے سے باہر نہیں نکلے؟" سلاٹر کی آواز میں بلا کی حیرت در آئی۔

"کیا وہ راستہ غار کے منہ کے آس پاس ہی کہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، لیکن وہ پوری روشنی کے بغیر نظر نہیں آتا، وہ ایک دراڑ کی صورت

میں ہے۔"

"جب ہم اس راستے کے ذریعے باہر نہیں نکلے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن اس پتھر کو تم ہرگز نہیں ہٹا سکتے تھے۔" سلاٹر کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ہم اس پتھر کو نہیں ہٹا سکے، لیکن شاید تم نہیں جانتے۔ اس غار میں ایک تیسرا راستہ بھی ہے اور تیسرا راستہ غار کے دوسرے سرے پر ہے۔ جو ایک آبشار کے پاس نکلا ہے، اس آبشار نے غار کے نیچے میدان میں ایک جھیل کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔"

"اوہ! یہاں میرے آدمیوں سے چوک ہوئی۔ انہوں نے اس غار کے اندر بہت دور تک جا کر دیکھا تھا اور یہی خیال کیا تھا کہ غار کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

"وہ اتنا لمبا سفر کر بھی کس طرح سکتے تھے۔ ہمیں کئی دن تک چلنا پڑا ہے۔"

"اوہ!" سلاٹر کے منہ سے نکلا۔ چند لمحے کے لیے مکمل خاموشی طاری ہو گئی پھر فاروق کے منہ سے نکلا۔

"ہاں تو مسٹر سلاٹر۔ تمہاری کہانی اُدھوری رہ گئی، مجھے تو اس میں کسی ناول کا مزا آ رہا ہے، مہربانی فرما کر جلد از جلد اس کہانی کو مکمل کر دیجیے، تاکہ ہماری بے چینی اور بے قراری رفع ہو۔ اور ہم سکون کا سانس لے سکیں۔"

"سکون کا سانس تو فی الحال تم نہیں لے سکو گے۔ کانفرنس روم میں سو سے زائد جسم بغیر سروں کے جب دیکھنے کو ملیں گے تو تمہارا سارا اطمینان رخصت ہو جائے گا، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کو اس غار میں بند کرنے کے باوجود میں

نے تمہارے نکل آنے کے ایک فیصد امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا، لہٰذا یہاں پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا۔ پھر یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ تم اگر یہاں تک پہنچ گئے تو ہو سکتا ہے کہ مائیکوں میں چھپے ہوئے بم تم لوگوں کو نظر آ جائیں، اس صورت میں تم لوگ فوراً بجلی گھر کا رخ کرتے۔ چنانچہ یہاں میں نے چارج سنبھال لیا تھا۔ کیونکہ تم لوگوں سے میں ہی اچھی طرح نبٹ سکتا ہوں۔ یہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تم لوگ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہو۔ اور یہ جو تمہارا اتنا نام ہے، انہی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ لیجیے۔ مہمان کانفرنس روم میں پہنچ چکے ہیں۔ اب وہ مشروبات پینا شروع کر دیں گے اور اس کے ساتھ ہی تمہارے ملک کے صدر افتتاحی تقریر کرنا شروع کر دیں گے۔ میں یہ پہلا بٹن دبا رہا ہوں۔ اس بٹن کے دبانے پر مائیک کام کرنا شروع کر دیں گے، ہال میں آواز گونجنے لگے گی۔ ہیلو کیپٹن۔ کیا تم ہیڈ فون پر میری آواز سن رہے ہو اور اس وقت کی تمام باتیں سن چکے ہو۔"

"یس سر!" کمرے میں کیپٹن کی آواز گونجی۔

"اور کیا تم کانفرنس روم میں آوازوں کے آلات کے پاس موجود ہو۔"

"یس سر!"

"کیا میرا اندازہ درست ہے۔ تمام مہمان کرسیوں پر بیٹھ چکے ہیں اور انہوں نے مشروبات کے گلاس اٹھا لیے ہیں۔"

"جی ہاں! صدر مملکت اب افتتاحی تقریر کے لیے اٹھ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بٹن دبا رہا ہوں۔ مائیک کام کرنے لگیں تو مجھے بتا دینا۔"

"اوکے سر!" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اس کے ساتھ ہی سلاٹر اٹھا اور اس نے ان تین میں سے اوپر والا بٹن دبا

دیا۔ جنہیں دیکھ کر پروفیسر داؤد ہو گئے تھے۔

"تمام ٹھیک کام کر رہے ہیں سر۔" صاحب صدر اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔"

"ٹھیک۔ ان کی تقریر شروع ہونے کے ایک منٹ بعد ہی میں دوسرا بٹن دبا دوں گا۔ تم اس سے دس سیکنڈ پہلے کانفرنس روم سے نکل آؤ گے۔ اور جلد گھر کے باہر پہنچ جاؤ گے۔"

"او کے سر!" دوسری طرف سے کیپٹن نے کہا۔

سلاٹر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تم نے اس وقت بھی ایک فیصد ناکامی کا جائزہ لے رکھا ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سلاٹر چونکا۔

"مطلب یہ کہ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ ہماری موجودگی میں تم نہایت اطمینان سے دوسرا بٹن دبا کر اپنے منصوبے کا آخری مرحلہ بھی طے کر لو گے جب کہ ہم لوگ جانوں پر کھیلنا بھی جانتے ہیں اور اپنے ملک اور قوم کے لیے کسی خطرے کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔ ایسی صورت میں کہ یہ تمام اسلامی ملکوں کا معاملہ بھی ہے، ہم کس طرح چپ چاپ کھڑے کانفرنس روم کو قتل گاہ بنتے دیکھتے رہیں گے۔"

"لیکن۔ تم لوگ کر ہی کیا سکتے ہو۔"

"ہم ہم کیا نہیں کر سکتے۔ یہ دیکھو۔" انسپکٹر جمشید کی آواز میں اچانک بلا کی زی آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا جسم ہوا میں اچھلا اور اس طرح اچھلا جیسے بہت ہ طاقت ور سپرنگوں نے انہیں اچھال پھینکا ہو۔

"لوٹ لگا جاؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے باقیوں سے چلا کر کہا۔

ایک ساتھ کئی فائر انسپکٹر جمشید پر ہوئے، لیکن اتنی دیر میں وہ نیچے آ چکے تھے اور گولیاں اوپر رخ کر کے چلائی گئی تھیں۔ چونکہ سب نے ان پر فائر کیے تھے، اس لیے باقیوں کو لوٹ لگانے کا موقع مل گیا۔ یہی نہیں، انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان تو ان پر بجلی اور طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے گرتے ہی اپنے ہاتھوں اور پیروں کو کچھ اس طرح استعمال کیا کہ وہ سب بوکھلا کر رہ گئے، پستول چلانا بھول گئے۔ سلاٹر چند سیکنڈ تک تو بھونچکا بنا اس منظر کو دیکھتا رہا پھر جیسے اسے بھی اچانک ہوش آ گیا، وہ بلا کی تیزی سے اٹھا اور ان سوئچوں کی طرف بڑھا جن میں سے اسے دوسرا دبانا تھا۔ محمود اور فرحت اس کے نزدیک تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے چھلانگیں لگائیں اور اس کے راستے میں آ گئے، مگر وہ بھلا انہیں کیا خاطر میں لاتا۔ ایک ایک مکا دونوں کے جبڑوں پر پڑا اور وہ دوسری طرف الٹ گئے۔ اس دوران انسپکٹر کامران مرزا کو اس تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے دائیں ہاتھ کی ہڈی اس کی گردن پر دے ماری، اس نے اپنے بازو پر اس وار کو روکا اور انسپکٹر کامران مرزا کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ کی ہڈی کسی لوہے کے راڈ سے ٹکرائی ہو۔ تاہم وہ بھی اس کے راستے سے نہ ہٹے اور اس سے لپٹ گئے۔ وہ ان سے قد میں بھی چھوٹا تھا اور جسم میں بھی پتلا دبلا تھا، لہٰذا انہوں نے سوچا، کیوں نہ اسے بازوؤں میں بھر کر بے بس کر دیں۔ ان کے ارادے کو بھانپ کر سلاٹر زور سے ہنسا، اس کی ہنسی اگرچہ بے ڈھنگی تھی۔ لیکن اس میں بھی گہرا طنز تھا اور دوسرے ہی لمحے انسپکٹر کامران مرزا کو اس طنزیہ ہنسی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ سلاٹر نے بھی ان کی کمر کے گرد بازو ڈال دیے تھے۔ اور اب جو اس نے ان کے جسم کو بھینچا تو انہیں اپنی پسلیاں تڑختی محسوس ہوئیں۔ انہوں نے بھی اس کے جسم پر پورا زور لگایا، لیکن وہ تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس پر خاک بھی اثر نہ ہوا، تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ انہوں نے اس سوئچ کی طرف پیش قدمی روک دی تھی۔ اور

پھر اچانک ان کے ذہن میں نہ جانے کیا آئی کہ سلاٹر کو زمین سے اوپر اٹھانے کے لیے زور لگا ڈالا۔ اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئے، کیونکہ سلاٹر بہر حال ان سے ہلکا تھا۔ اس حالت میں بھی سلاٹر بری طرح انہیں بھینچے ڈال رہا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے تکلیف کی پروا کیے بغیر اسے سوئچ سے دور ہٹانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ کمرے کے دوسرے سرے تک لے آئے۔

"مسٹر سلاٹر۔ اب تمہیں سوئچ تک جانے کے لیے پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ میں اگر بے ہوش ہو کر گر بھی جاؤں، تب بھی تمہارے راستے میں کئی دیواریں آ کھڑی ہوں گی۔" انہوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا، کیونکہ ان کا سینہ ہر لمحے اور زیادہ بھنچتا جا رہا تھا اور سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ ایسے میں سلاٹر دھاڑا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم میں سے کوئی دوسرا سوئچ کیوں نہیں دبا دیتا۔"

اس کے ساتھی جیسے اچانک ہوش میں آ گئے۔ اب ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سوئچ تک پہنچ جائے۔ لیکن اتفاق کی بات یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے ایک آدمی موجود تھا۔ دونوں ٹیموں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ یہ مقابلہ اب چونکہ دست بدست ہو رہا تھا، اس میں وہ پستولوں کو بالکل بھول گئے تھے، البتہ سلاٹر کے ساتھی پستولوں کو ان کے سروں پر مارنے کی کوشش میں ضرور مصروف تھے، تاہم اب تک ان میں سے چند ایک کے پستول چھین بھی لیے گئے تھے۔ انسپکٹر جمشید، خان رحمان اور منور علی خان ان میں سے کئی پر بھاری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا پلہ بھاری تھا۔ لہٰذا وہ انہیں سوئچ کی طرف کس طرح بڑھ جانے دیتے۔ ...چوں میں سے کوئی کمزور پڑتا دکھائی دیتا تو ان تینوں میں سے کوئی فوراً ان کی مدد کو پہنچ ...تا۔ ایسے میں انہوں نے سلاٹر کو کہتے سنا:

"تو انسپکٹر جمشید۔ تمہارے ساتھی انسپکٹر کامران مرزا تو گئے کام سے۔ یہ تو دم توڑ گئے۔"

"نہیں۔" آفتاب، آصف اور فرحت کی چیخ نے پورے ہال پر لرزہ طاری کر دیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی تھرا اٹھے۔

"جنگ جاری رکھو۔ ہم سے کسی ایک کے یا سب کے مارے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو تمام اسلامی سربراہوں کو بچانا ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے اور وہ سب پھر سے دشمن سے بھڑ گئے۔ لڑتے ہوئے انہوں نے دیکھا۔ انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ ابھی تک سلاٹر کے گرد کسے ہوئے تھے۔ البتہ ان کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ سلاٹر اپنے جسم سے انہیں الگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا، لیکن ان کے ہاتھ کسی طرح الگ ہی نہیں ہو رہے تھے آخر جب سلاٹر کوشش کر کے تھک آ گیا تو ان کے جسم کو بھی ساتھ لے کر سوئچ کی طرف گھسٹنے لگا۔ لیکن اس کے گھسٹنے کی رفتار چیونٹی کی رفتار سے زیادہ نہیں تھی۔ انسپکٹر کامران مرزا زندہ تھے۔ یا مردہ۔ اب بھی اس کے راستے کی دیوار تھے۔

انسپکٹر جمشید نے صورت حال کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اب سلاٹر زیادہ دیر تک سوئچ سے دور نہیں رہ سکے گا۔ انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ زیادہ دیر تک اس کے جسم سے لپٹے نہیں رہ سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کن مکے برسانے شروع کر دیے۔ یہ مکے ایسے تھے کہ جس کے بھی منہ پر لگے، وہ دوسری طرف الٹ گیا، جونہی کوئی گرتا، محمود، فاروق وغیرہ اسے چھاپ بیٹھتے۔ اچانک فرزانہ نے سلاٹر کا جسم انسپکٹر کامران مرزا کے جسم سے الگ ہوتے دیکھا، اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس کے راستے میں تن کر کھڑی ہو گئی۔ سلاٹر اسے دیکھ کر ہنسا، ساتھ ہی اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا، فرزانہ نے ایک جھکائی دی اور سلاٹر کا ہاتھ اس کے سر سے...

اوپر سے گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دوسرا ہاتھ فرزانہ کے جسم کی طرف بڑھتا، محمود اس کے پیچھے پہنچ گیا اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ نے لوٹ لگائی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ فاروق اس وقت ایک دشمن سے پوری طرح بھڑا ہوا تھا۔ وہ تین بار ریوالور کا دستہ فاروق کے سر پر مارنے کی اپنی سی کوشش کر چکا تھا۔ چوتھی مرتبہ جو اس نے مارا تو فاروق ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ دیوار سے لگا ہوا تھا، دشمن کا ہاتھ بھرپور انداز میں دیوار پر پڑا اور وہ بلبلا اٹھا، ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور فاروق کے بالکل سامنے گرا، وہ پہلے ہی نیچے بیٹھا ہوا تھا، اس نے فوراً پستول اٹھالیا اور اس کے سینے پر فائر جھونک دیا، وہ چیخ مار کر دوسری طرف الٹ گیا۔ اب فاروق ریوالور کو نال کی طرف سے پکڑ کر ان کی مدد کے لیے بڑھا۔ سلاٹر خود کو ان سے چھڑانے کے لیے جھٹکا دینے کی تیاری کر چکا تھا کہ ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر پڑا۔ اس نے بھنا کر فاروق کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ اس کی طرف اچھال دیا۔ اس کا ہاتھ فاروق کے منہ پر پڑا اور وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ ریوالور کے دستے نے سلاٹر کو تکلیف تو پہنچائی تھی مگر اتنی نہیں کہ وہ بے کار ہو جاتا۔ اس وقت تک آفتاب، آصف اور فرحت بھی اس طرح متوجہ ہو چکے تھے۔ تینوں نے سلاٹر کو گھیر لیا۔ آفتاب اس کے ایک بازو پر چمٹ گیا، آصف دوسرے بازو سے، رہ گئی فرحت تو اسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ سلاٹر کی کمر پر سر سے ٹکر دے ماری، لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ نیچے فرزانہ اس کی ٹانگوں سے چمٹی ہوئی ہے۔ فرحت نے محسوس کیا کہ اس کی ٹکر نے کوئی خاص کام نہیں دکھایا تھا۔ چنانچہ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور ایک گرا ہوا ریوالور اٹھالیا اور تابڑ توڑ سلاٹر کے سر پر برسانے لگی۔

ادھر منو علی خان اور خان رحمان کے ہاتھوں میں بھی ایک ایک ریوالور

آ گیا اور انہوں نے بھی انہیں نالوں کی طرف سے پکڑ کر دھواں دھار انداز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میدان بہت جلد صاف ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید نے بھی اپنے آخری مقابل کو دے پٹخا۔ اب سب کے سب سلاٹر کی طرف متوجہ ہوئے۔

''بس بھئی۔ اب تم اسے چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ مجھے اس سے اپنا پرانا حساب بھی چکانا ہے۔'' انسپکٹر جمشید پرسکون آواز میں بولے ''اور ہاں اپنے انکل کی بھی خبر لو۔''

انہوں نے سلاٹر کو چھوڑ دیا اور انسپکٹر کامران مرزا کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے، ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی، اس مسکراہٹ سے اطمینان جھانک رہا تھا، پھر ان کے لب ہلے۔

''تو ہم نے ابھی تک اسے سوئچ تک پہنچنے نہیں دیا۔''

''جی ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔ سلاٹر کے تمام ساتھی ڈھیر ہو چکے ہیں۔ اب صرف سلاٹر باقی ہے اور انکل انسپکٹر جمشید اس کے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔''

''بہت خوب۔ یہ ہوئی نا بات۔'' انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

اسی وقت سلاٹر نے انسپکٹر جمشید پر اپنے خاص انداز میں چھلانگ لگائی اور زمین پر آ رہا۔ اس نے سنا، انسپکٹر جمشید دور کھڑے کہہ رہے تھے:

''تمہارا داؤ پرانا ہو چکا، اب کوئی نیا داؤ آزماؤ۔''

سلاٹر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے، اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی، ساتھ ہی انسپکٹر جمشید اپنی جگہ سے اچھلے، دونوں فضا میں ایک دوسرے سے پورے زور سے ٹکرائے اور دونوں ایک ساتھ نیچے گرے، گرتے ہی سلاٹر نے چاہا کہ سوئچ کی طرف دوڑ لگا دے، لیکن انسپکٹر جمشید کی ٹانگ اس کے آڑے آئی، وہ منہ کے بل گرا۔ تاہم بلا کی تیزی سے اٹھا اور پھر اس طرف جھپٹا۔ اس بار وہ انسپکٹر جمشید کو

جھکائی دینے میں کامیاب ہو گیا اور تیر کی طرح سوچ کی طرف چلا۔ عین اس وقت جب اس کا ہاتھ سوچ سے ایک انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ انہوں نے دیکھا، وہ انسپکٹر کامران مرزا تھے۔ جو نہ جانے کس وقت سوچ کی طرف کھسک آئے تھے۔

انسپکٹر جمشید کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ انہوں نے سلاٹر کو بازو سے پکڑ اور ایک زوردار جھٹکا مارا۔ وہ سوچ سے دور ہٹتا چلا گیا۔

"تم سب لوگ سوچ کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ انہوں نے ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ ان کے آگے انسپکٹر کامران مرزا، منور علی خان اور خان رحمان کھڑے ہو گئے، گویا سوچ کے سامنے اب دو دیواریں کھڑی ہو گئی تھیں۔ سلاٹر اگر انسپکٹر جمشید کو نیچے دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا تب بھی اسے دو دیواروں سے ٹکرانا پڑتا۔ عین اس وقت سلاٹر نے انسپکٹر جمشید پر چھلانگ لگائی۔ اس بار اس نے ایک نئے رخ سے وار کیا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے بچنے کی پوری کوشش کی، لیکن لپیٹ میں آ ہی گئے۔ کمر کے بل فرش پر گرے اور سلاٹر ان پر چڑھ دوڑا۔

"تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا۔" انسپکٹر جمشید نے ان سب کو خبردار کیا۔

سلاٹر کے دونوں ہاتھ انسپکٹر جمشید کے گلے پر سرک آئے اور وہ ان کے گلے پر پوری طرح دباؤ ڈالنے لگا۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا، پھر آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں، وہ بے تاب ہو گئے۔ ان کے دل سینوں میں دھک دھک کرنے لگے۔

"ابا جان! ہمیں مدد کی اجازت دیجیے۔"

"نن۔ نہیں۔" ان کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

ساتھ ہی ان کی ٹانگیں حرکت میں آ گئیں اور سلاٹر کی گردن کی طرف بڑھنے لگیں، سلاٹر ان کی ٹانگوں کی طرف سے بے خبر ان کی گردن پر دباؤ ڈالے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ان کی ٹانگوں نے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔ انہوں نے اسے اوپر اٹھانے کے لیے زور لگانا شروع کیا، ادھر سلاٹر کی کوشش یہ تھی کہ اس کے ہاتھ ان کی گردن پر سے نہ ہٹیں۔ تقریباً ایک منٹ تک یہی کیفیت رہی اور پھر سلاٹر کے ہاتھ ان کی گردن سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور سلاٹر کو اٹھا پھینکا۔ وہ سیدھا انسپکٹر کامران مرزا کی طرف آیا۔ انہوں نے جوتے کی نوک سے ان کا استقبال کیا، نوک اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی کمر پر ایک دو ہتھڑ پورے زور سے رسید کر دیا، وہ دھپ کی آواز سے فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

"اس کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اسے جکڑ لیں۔ خان رحمان۔ تم کہیں سے رسی کا بندوبست کرو۔ تاکہ ہم انہیں باندھ لیں اور ہاں آئی جی صاحب کو اطلاع دے دو۔ وہ کچھ ملٹری کے جوان لے کر آ جائیں اور ان پر قابو پا لیں۔"

"اچھی بات ہے۔" خان رحمان نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھے، جونہی انہوں نے دروازہ کھولا، ان کے منہ پر کسی کی لات پورے زور سے لگی اور وہ الٹ کر پیچھے گرے۔ وہ سب چونک اٹھے انہوں نے دیکھا، کیپٹن ہال کے دروازے میں تنا کھڑا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں دو پستول تھے۔

☆☆☆

گفتگو کا محاذ

وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ کیپٹن کو تو وہ بھول ہی گئے تھے۔ چند لمحے تک وہ اس کی طرف اور وہ ان کی طرف دیکھتا رہا، آخر اس نے کہا:

"پانسہ ایک بار پھر پلٹ گیا ہے دوستو۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"چاہے کچھ ہو جائے، ہم تم میں سے کسی کو بھی سوئچ تک نہیں پہنچنے دیں گے۔" فاروق نے سرد آواز میں کہا۔

"میرے ریوالوروں کی گولیاں میرے لیے راستہ بنائیں گی۔ دونوں میں چودہ گولیاں ہیں اور تم لوگ دس گیارہ سے زائد نہیں۔" اس نے غرا کر کہا۔

"لیکن تم نے یہ کس طرح جان لیا کہ تمہاری ہر گولی نشانے پر ہی بیٹھے گی، جبکہ اس سے پہلے بھی ہم دس گیارہ پستولوں کی زد میں رہ چکے ہیں۔"

"دیکھا جائے گا، میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ تم پیچھے ہٹنا شروع کر دو، لیکن سوئچ والی دیوار کی طرف نہیں۔ دائیں طرف والی دیوار کی سمت میں۔" اس نے گویا حکم دیا۔

"تم آگے بڑھو۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وقت تک وہ بھی خود کو سنبھال چکے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا کی حالت بھی بہتر تھی تو صاف ظاہر تھا کہ کیپٹن سلاٹر بہت پھرتیلا اور لڑاکا نہیں ہو سکتا تھا۔ بس وہ موقع

کی تاک میں تھے۔

"وہ مارا۔ بہت اچھے موقع پر آئے انکل۔" اچانک محمود نے نعرہ لگایا۔

کیپٹن بوکھلا کر مڑا، ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا کے پاؤں کی زبردست ٹھوکر اس کے پہلو میں لگی، وہ لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی مگر سنبھل نہ سکا۔ گرتے گرتے بھی ان نے ایک فائر جھونک مارا، لیکن گولی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اسی وقت منور علی خان نے اس پر چھلانگ لگا دی، خان رحمان بھی جھپٹے اور ریوالور اس کے ہاتھوں سے نکال لیے۔

"خدا کا شکر ہے۔ یہ معرکہ بھی سر ہوا۔ میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔" فرحت نے پرسکون آواز میں کہا۔

"تم میں یہی تو بُری بات ہے، بات بے بات گھبرا جاتی ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور تم نے تو جیسے گھبرانا سیکھا ہی نہیں۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"سیکھا تو خیر تھا ایک بار۔ لیکن سکھانے والا ہی اناڑی نکلا۔" فاروق نے شریر انداز میں کہا۔

"اچھا۔ کون تھا وہ؟"

"فرزانہ!" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"سراسر الزام ہے۔ گھبراہٹ کس چڑیا کا نام ہے، میں نہیں جانتی۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ گھبراہٹ کسی چڑیا کا نام ہے۔" فاروق بولا۔

"مہا بھارت شروع کرنے سے پہلے ان لوگوں کا کوئی بندوبست بھی ہونا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید ناگوار لہجے میں بولے۔

اب خان رحمان جلدی سے باہر نکل گئے۔ وہ واپس لوٹے تو ان کے ساتھ

شیخ صاحب، خان صاحب اور ملٹری کے کتنے ہی جوان تھے۔ انہوں نے آتے ہی سلاٹر اور اس کے ساتھیوں کو جکڑ لیا۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی تفصیل سنائی۔ آئی جی صاحبان سناٹے میں آ گئے، کئی سیکنڈ تک ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ سو سے زائد مہمان موت کا لقمہ بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ کانفرنس روم قتل گاہ بن چکا ہوتا اگر بچے گھر میں وہ سلاٹر کے مقابلے میں ناکام ہو جاتے۔

"خدا نے رحم فرما دیا ہم پر۔ ورنہ ہم تو کہیں کے نہیں رہ گئے تھے۔" آخر شیخ صاحب نے لرزتی آواز میں کہا۔

"تو کیا کانفرنس جاری رہے گی۔" خان صاحب بولے۔

"جی ہاں! پروگرام کے مطابق جاری رہے گی، کیونکہ جب تک دوسرا بٹن دبایا جائے گا، اس وقت تک کچھ نہیں ہو گا۔"

"لیکن یہ تیسرا بٹن کس مقصد کے لیے ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ پوری عمارت کی لائٹ وغیرہ آف کرنے کے لیے لگایا گیا ہو گا، یا کسی اور مقصد کے تحت لگایا ہو گا۔ کیونکہ ابھی انہیں فرار بھی ہونا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے خیال ظاہر کیا۔

"کیوں مسٹر سلاٹر۔ آپ بتائیں گے۔ اس تیسرے سوئچ کا مقصد۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ میں اپنی ناکامی پر جھنجلایا نہیں کرتا۔ تیسرا بٹن کانفرنس روم میں ایک آخری اور بڑا دھماکا کرنے کے لیے تھا۔ اس دھماکے سے ہوتا یہ کہ پورا کانفرنس روم نیچے بیٹھ جاتا۔ باہر کے لوگ ملبہ ہٹانے میں لگ جاتے اور ہم اطمینان سے چھت کا رخ کرتے۔" اس کی آواز حیرت انگیز طور پر پُر سکون تھی۔

"خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں بال بال بچا لیا۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"جمشید۔ کانفرنس ختم ہونے تک تم سب لوگ یہیں موجود رہو۔ ابھی ہم

ان لوگوں کو بھی یہیں رکھنے پر مجبور ہیں۔" آئی جی صاحب بولے۔

"فکر نہ کریں۔ اب ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہیں میں اور میرے ساتھی اپنے ہاتھوں سے رسیوں سے باندھیں گے۔" انہوں نے کہا۔

اور پھر انہوں نے باندھنے کا کام شروع کر دیا۔ سلاٹر کو خود انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے مل کر باندھا۔

"ابھی تم لوگ تو مجھے اس طرح باندھ رہے ہو جیسے اب زندگی بھر ان رسیوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" سلاٹر نے ہنس کر کہا۔ انہیں اس کی جرأت اور ہمت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ناکامی کے ذرا بھی آثار نہیں تھے۔

"ہم تمام اسلامی ملکوں کے لیے کسی خطرے کا امکان باقی نہیں رہنے دے سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اور کیا۔ ذرا کانفرنس ختم ہولے اور مہمان گیسٹ ہاؤس چلے جائیں اس کے بعد ہم تمہاری یہ رسیاں خوشی خوشی کھول دیں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ خوشی خوشی رسیاں کس طرح کھولی جاتی ہیں۔" آفتاب نے چوٹ کی۔

"ارے تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔ خیر۔ کانفرنس کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ اس وقت تک کے لیے صبر کرو۔" فاروق بولا۔

"تو تم ابھی کیوں نہیں بتا دیتے۔" اس نے منہ بنایا۔

"بعض باتیں بتائی نہیں جا سکتیں۔ کر کے دکھائی جا سکتی ہیں اور بعض باتیں صرف بتائی جا سکتی ہیں، کر کے نہیں دکھائی جا سکتیں۔" فاروق فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اب مجھے کیا پتا تھا کہ تم باتوں کی قسموں کے بارے میں اتنا کچھ جانتے

ہو۔" آفتاب نے فوراً سامنے بتایا۔

"لیکن بھئی۔ وہ ہمارے پیکٹ کا کیا بنے گا۔" آصف کو جیسے اچانک خیال آیا۔

"انوار شام کے گھر میں ہی کہیں رکھا ہوگا، اس نے وہ گھر کرائے پر لیا ہوا ہوگا۔ لہٰذا یا تو اصل مالک سے وہ پیکٹ مل جائے گا، یا پھر نئے کرائے دار سے۔ یہ تمہیں میں نے بتادی ہے، پیکٹ حاصل کرنا اب تمہارا کام ہے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ترکیب بتانے میں فرزانہ کا جواب نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"نہ جانے کیوں۔ اس وقت مجھے وہ وادی اور وہ میدان بہت یاد آرہا ہے۔" آفتاب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"اگر اتنا ہی زیادہ یاد آرہا ہے تو چھت پر مسٹر سلاٹر کے جہاز ارے۔" فرزانہ چونکی۔

"یہ مسٹر سلاٹر کے جہاز کے بعد ارے کہاں سے نکل آیا۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"فرزانہ کے حلق سے، تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔" آفتاب بولا۔

"لیکن ذرا فرزانہ کا منہ تو دیکھو۔ اس پر اڑھائی کیوں بج رہے ہیں۔" فرحت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"چلو اچھا ہے، ٹھیک اڑھائی بجے ہمیں کوئی گھڑی دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑا کرے گی، بس فرزانہ کے منہ کی طرف دیکھ لیا کریں گے۔" فاروق چہکا۔

"میں نے اس سے زیادہ بے وقوفانہ بات آج تک نہیں سنی۔" آفتاب

نے بھی ہنس کر کہا۔

"پھر تو یہ بات ایک ریکارڈ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"بھئی کم از کم فرزانہ کو تو بات مکمل کرنے دو، کیا خبر اسے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"جی ہاں انکل۔ ہم جہاز کے پائلٹوں کو تو بھول ہی گئے، اگر انہیں کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے باس اور باس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو وہ جہاز لے کر اڑ جائیں گے۔ جب کہ دونوں جہاز اس مہم کے مال غنیمت ہیں اور دوسرے یہ کہ ہیروں میں بھی ان کے ساتھی موجود ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ ٹھہرو۔ پہلے ملٹری کے جوانوں کو چھت پر بھیجنے کا انتظام کر دیں اور ہیروں کی نگرانی کے لیے بھی کہہ دیں۔"

"بہت دیر بعد خیال آیا۔ وہ دونوں اب تک جا بھی چکے ہیں۔" سلاٹر ایک بار پھر زور سے ہنسا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ اگر مقررہ وقت تک میں نہ آؤں تو جہاز لے کر چلے جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر چند ملٹری کے جوانوں کو اوپ بھیج کر اس کی بات کی تصدیق کرائی گئی، وہاں واقعی کوئی جہاز نہیں تھے، البتہ جہاز ک پہیوں کے نشانات ضرور موجود تھے۔

"مسٹر سلاٹر۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ غار کے منہ پر ہم نے چ رکھے جانے کی آواز نہیں سنی تھی۔ آخر آواز پیدا کیے بغیر پتھر کس طرح رکھا گیا تھ" محمود نے سوال اٹھایا۔

"دراصل جسے تم لوگ غار کا منہ خیال کرتے رہے ہو، وہ اس کا منہ ہے ہی نہیں۔ غار تو وہاں سے بالکل بند ہے۔ لیکن نظر ایسا آتا ہے جیسے وہ غار کا منہ ہو اور اس پر پتھر رکھ دیا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ تم غار کے ایک حصے پر ہی زور لگاتے رہے ہو، اس غار میں داخل ہونے کا راستہ تو بس وہ دراڑ ہی ہے۔ جو اندھیرے میں کسی طرح بھی نظر نہیں آ سکتی۔ ہاں پوری روشنی غار کے اندر کر دی جائے تو نظر آ سکتی ہے۔"

"اوہ۔ تو ہم بلاوجہ ہی زور لگاتے رہے۔" فاروق نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ لیکن پھر بھی تم لوگ غار سے تو نکل ہی آئے تھے۔ کاش۔ میرے آدمیوں نے دور تک جا کر غار کے اس سرے کا سراغ لگا لیا ہوتا۔"

"اب اس شکست کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے۔" آفتاب نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے وہ اس سے انٹرویو لے رہے ہوں۔

"بس پروگرام کیا ہوگا۔ اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔

"لیکن مسٹر سلاٹر۔ معاف کرنا۔ تم ہمارے ملک کے مجرم ہو اور ہم مجرموں کو یونہی نہیں چھوڑ دیا کرتے۔ یہاں سے تمہیں حوالات کی سیر کے لیے جایا جائے گا، اور پھر جیل دکھائی جائے گی، ہمارے ہاں کی جیلیں دیکھ کر تمہاری طبیعت ضرور خوش ہو جائے گی۔"

"لوہے کی سلاخیں مجھے اپنے دوسری طرف نہیں رکھ سکتیں۔"

"ارے۔ تب تو ہمیں تمہارے لیے خاص قسم کی سلاخوں کا بندوبست کرنا ـے گا۔" فرزانہ نے شریر انداز میں کہا۔

"ضرور تیار کراؤ۔ لیکن تمہیں پھر بھی مایوسی ہوگی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا اچھی بات ہے؟" سلاٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہی کہ تمہیں مایوس ہونا پڑے گا۔ ہم خود بھی مایوسی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، کم بخت ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے بھی گھبراتی ہے، جان نکلتی ہے اس کی ہم سے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم لوگوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔"

"دوسرے کیا، ہم تو تیسرے لفظوں میں بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں۔" آفتاب بول پڑا۔

"دیکھا مسٹر سلاٹر۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔" فاروق مسکرایا۔

"چیونٹی کے پر۔ کہاں۔" سلاٹر کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"اوہو۔ شاید آپ کو اردو کے اس محاورے کا پتا نہیں۔ ایک تو ہماری گفتگو میں یہ محاورے اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلے آتے ہیں اور وہ بھی بے مہار اونٹ کی طرح۔ اب شاید ہمیں انہیں نکیل ڈالنا پڑے گی۔" فاروق نے کڑوے کسیلے انداز میں کہا۔

"دیکھا انکل۔ اردو کے محاروں کو نکیل ڈالنے چلے ہیں اور جملے میں کئی محاورے بھی گھسیٹ گئے ہیں یہ حضرت۔" فرزانہ نے تلملاتے ہوئے لہجے میں انسپکٹر کامران مرزا سے کہا۔

"ہاں واقعی۔ بہت پسند آیا ہے، مجھے اس کا جملہ۔" انسپکٹر کامران مرزا خوش ہو کر بولے۔

"لیجیے۔ میں داغ رہی تھی شکایت اور آپ الٹا تعریف کرنے لگے۔"

فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اب تم نے جو محاورہ استعمال کر ڈالا۔ یعنی شکایت داغنا"

"ارے۔ تو کیا یہ بھی محاورہ ہے۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔ گویا تم لوگ جانے بوجھے بغیر بھی محاورے بول جاتے ہو۔" آصف نے کاٹ کھانے کے انداز میں کہا۔

"ہم جانے بوجھے بغیر محاورے نہیں بولتے، محاورے جانے بوجھے بغیر ہمارے منہ میں آ جاتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"دھت تیرے کی۔ اب تو شروع ہو گئی بات محاورات کی۔ ختم تو ہونے سے رہی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا اپنی ران کا کباڑا کرتے ہو بھئی۔" آصف نے شوخ آواز میں کہا۔

"اگر اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنی ران محمود کے ہاتھ کے آگے پیش کر دو۔" فرحت نے رائے پیش کی۔

"ابھی مجھے اپنی ران سے کچھ کام لینے ہیں۔ جب بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اب کوئی کام لینے کے لیے باقی نہیں رہ گیا تو اپنی ٹانگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محمود کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔" آصف نے پورے خلوص سے کہا۔

"مسٹر سلاٹر۔ ان کی باتیں سن رہے ہو۔" خان رحمان اچانک بولے۔

"ہاں! بہت مزا آ رہا ہے۔ بڑی پُر لطف بحث کرتے ہیں یہ۔" سلاٹر نے خوش ہو کر کہا۔

"ابھی تو ان کی باتیں شروع ہوئی ہیں، اس لیے تم خوش ہو رہے ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد تمہارے کان جب ان کی باتیں سن سن کر پکنے لگیں گے تو سارا لطف

دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہو گا۔" سلاٹر نے انکار میں سر ہلایا۔

"بھئی ہمارے ساتھ ایسا ہوتا جو رہتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پُر زور لہجے میں کہا۔

"ارے ہاں! ہمارے رنگ کیسے صاف ہوں گے؟"

"خود بخود۔ پندرہ بیس دن تک صاف ہو جائیں گے۔" اس نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"کاش میں ان سب کو اپنے ملک لے جا سکوں۔ وہاں میں ان سے بہت زبردست کام لے سکتا ہوں۔" سلاٹر نے کہا۔

"ہم اپنے ملک کے سوا کسی ملک کے لیے کام نہیں کر سکتے۔" محمود نے منہ بنایا۔

اس کے طریقے ہمارے سائنس دانوں کو آتے ہیں، تم لوگ خوش خوش میرے ملک کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جاؤ گے۔ بلکہ اپنے ملک کے خلاف کام کرنے کے لیے بھی۔" سلاٹر نے کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، وہ اس خیال سے بھی کانپ گئے تھے۔

"اب تو میں ضرور ایسا کر کے دکھاؤں گا۔" سلاٹر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ابا جان! آپ نے سنا۔ سلاٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں سن لیا۔ فکر نہ کرو، بعض لوگ اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش میں مبتلا ہوتے ہیں۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"خیر خیر۔ تم لوگ بہت جلد دیکھ لو گے۔" سلاٹر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

آخر خدا خدا کر کے کانفرنس ختم ہوئی، مہمان رخصت ہوئے۔ ایسے میں آئی جی صاحب نے ان سے آ کر کہا۔

"صدر مملکت عمارت سے باہر کار میں بیٹھے ہیں، تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ فوراً باہر نکلے۔ کار کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے صدر مملکت کو سلام کیا تو وہ بولے۔

"قوم تم پر جتنا بھی فخر کرے، کم ہے، شیخ صاحب نے مجھے ساری باتیں بتا دی ہیں۔ آج تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ تم نے نہ صرف اپنے ملک کو بچا لیا، بلکہ تمام اسلامی ملکوں کو بچایا ہے۔ کل میں تمام سربراہوں کو یہ تفصیل سناؤں گا اور اس وقت وہ سب تم سے ملاقات کے خواہش مند ہوں گے، لہٰذا تم لوگ تیار رہنا۔"

"ارے باپ رے۔ اتنے بہت سے سربراہوں سے ملاقات کس قدر سنسنی خیز رہے گی۔" فاروق کے منہ سے بوکھلائے ہوئے لہجے میں نکلا۔ صدر مملکت ہنس پڑے اور انہوں نے ڈرائیور کو کار آگے بڑھانے کے اشارہ کر دیا۔

اب انہوں نے سلاٹر اور اس کے ساتھیوں کو ملٹری کے جوانوں کی نگرانی میں روانہ کیا اور خود گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچے تو پتا چلا، بیگم جمشید اور بیگم کامران مرزا میں خوب گاڑھی چھن رہی ہے اور جب سے بیگم کامران مرزا، یوسف خان کے ساتھ گھر پہنچی ہیں، اس وقت سے دونوں میں بات چیت ایک سیکنڈ کے لیے نہیں رکی، یہ بات ان لوگوں کو یوسف خان نے بتائی اور بولے۔

"اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ابھی تک مجھے چائے تک

نہیں پلائی۔ کھانے والے کو پوچھنا تو رہا در کنار۔"

وہ بے ساختہ مسکرانے لگے۔ آخر طے یہ ہوا کہ دونوں بیگمات باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ باقی لوگوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں بھی تیار کریں گی اور باقی سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گپیں ہانکیں گے۔ بچوں کو تو ایسے کسی موقعے کا جیسے ایک مدت سے انتظار تھا۔ اس سے پہلے ہوتا یہ آیا تھا کہ جب بھی کوئی مشترکہ مہم پیش آئی، اس کے اختتام پر وہ ہوائی اڈے سے ہی الگ ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں اس مرتبہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا، لیکن نہیں۔ ایک بلی کے بھاگوں نہیں۔ بہت سی بلیوں کے بھاگوں بہت سے چھینکے ٹوٹے تھے۔ ڈرائنگ روم میں جلد ہی جنگ کا منظر نظر آنے لگا۔ لیکن اچانک فون کی گھنٹی نے ان سب کو اس طرح خاموش کر دیا جیسے اچانک کوئی بھوت ان کے سامنے آ گیا ہو۔ اور پھر انسپکٹر جمشید نے اٹھ کر ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف کی آواز سن کر وہ چونک اٹھے۔ خاموشی سے گفتگو سنتے رہے اور پھر ریسیور رکھ کر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر نہ تو فکر اور پریشانی کے آثار تھے اور نہ خوشی کے۔

"آخر فون پر کون تھا جس نے آپ کو بات کرنے کی مہلت تک نہیں دی۔"

"سلاٹر تھا۔" انہوں نے ایک دم کہا۔

"جی کیا مطلب۔" وہ چلا اٹھے۔

"ہاں۔ فون پر سلاٹر تھا۔ کہہ رہا تھا۔ میں ملٹری کے جوانوں کی گرفت سے نکل بھاگا ہوں۔ اور ایک بار پھر انتقام لینے آؤں گا۔ بلکہ اس مرتبہ محمود، فاروق، فرزانہ، آفتاب، آصف اور فرحت کو اپنے ملک لے جائے بغیر نہیں رہوں گا۔ اور وہاں ان سے خود ہمارے ملک کے خلاف کام لوں گا۔"

"نہیں!" ان کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

"بھئی اس میں خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم سلاٹر کے منصوبوں کو دو مرتبہ ناکام بنا چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بے فکری کے انداز میں بولے۔

"پھر بھی مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ اسی وقت ہمیں پھر سے اغوا کرنے نہ آ جائے۔ پہلے ہی ہم اغوا کے چکر میں آئے رہے ہیں۔ آؤ بھئی۔ ہم چپ کے چپاپ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جائیں۔" فاروق نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہو گیا، باقیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا، بلکہ حامد سرور، ناز اور شائستہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی سے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت چالاک ہیں۔ علیحدہ کمرے میں باتیں کرنا چاہتے تھے۔"

فوراً ہی فاروق کا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔

"آپ ہم سے بھی چالاک ہیں۔ جو ہماری چالاکی کو بھانپ گئے۔"

اور وہ چھپنے لگے۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے فاروق ان سے کہہ رہا تھا:

"اب شروع ہو گی صحیح معنوں میں مہابھارت۔ گویا آج گفتگو کی جنگ لڑی جائے گی۔ اب دیکھیں اس جنگ کا فیصلہ کس کے حق میں رہتا ہے۔"

"صاف ظاہر ہے۔ تمہارے اور آفتاب کے سوا یہ جنگ کون جیتے گا۔" فرحت نے جل بھن کر کہا۔

"تم تو پہلے ہی ہتھیار ڈالے دے رہی ہو۔" آصف نے منہ بنایا۔

"تو کیا تم ان دونوں سے مقابلہ کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں، ہم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ اگر ہار گئے تو کہہ

دیں گے، مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔"

"جو لوگ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی حوصلہ ہار جائیں۔ وہ کیا خاک مقابلہ کریں گے۔" فاروق بولا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے، گفتگو کا بازار گرم ہوا اور ایسا گرم ہوا کہ بڑی پارٹی کو ان کے کمرے کے دروازے پر آنا پڑا۔ انہوں نے جو دروازے سے کان لگائے تو اندر سے بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ آخر انہوں نے بوکھلا کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا، تقریباً ایک منٹ بعد کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ انہوں نے دیکھا سب پُرسکون انداز میں بیٹھے تھے۔

"اوہ خدا کا شکر ہے۔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ تم اندر لڑ پڑے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے اطمینان کا سانس لیا۔

"جی وہ۔ دراصل بات یہ ہے کہ۔" آفتاب کہتے کہتے رُک گیا۔

"بس رُک گئی اس کی تو سوئی۔" آصف نے منہ بنایا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم صرف جملوں سے لڑ رہے تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں جملوں سے کپڑے نہیں پھٹا کرتے۔ حلیے نہیں بگڑا کرتے خون نہیں نکلا کرتا۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"ہاں! ہم یہ جانتے ہیں۔ لیکن محلے والے یہ نہیں جانتے ہوں گے، کہیں وہ سب بوکھلا کر ہماری خیریت پوچھنے نہ آ جائیں۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی کے عالم میں بولے۔

"اوہ ہاں۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ اب ہم یہ جنگ محدود آواز میں لڑیں گے۔" آصف بولا۔

"چلو بھئی۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، آج یہ نہیں مانیں گے

انسپکٹر کامران مرزا نے تنگ آ کر کہا۔

جونہی وہ مڑے، کمرے کا دروازہ بند ہو گیا اور اس میں سے پھر ویسی ہی آواز آنے لگیں۔ انہوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر انسپکٹر جشید بولے:

"آیئے۔ ہم بیرونی دروازے پر اپنے پڑوسیوں کا استقبال کرنے چلیں۔"

ان کی بات پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، ساتھ ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ان سب کو بھی چھنے کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا انسپکٹر جشید کا یہ جملہ انہوں نے بھی سن لیا تھا۔

------------☆☆☆------------

اٹلانٹس پبلکیشنز

D-83 سائٹ۔ کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk

www.urdukorner.com

آئندہ ناول کی ایک جھلک

63 واں خاص نمبر

انسپکٹر جشید پارٹی، انسپکٹر کامران مرزا پارٹی اور شوکی برادرز کا مشترکہ خاص نمبر

شاگورہ کا بازیگر

مصنف: اشتیاق احمد

اغوا ، روشن، تمیں کا طوفان اور خلا میں ہنگامہ کے بعد اشتیاق احمد کا ایک اور ہنگامہ خیز خاص نمبر یکم نومبر 2008 کو منظر عام پر آ رہا ہے۔

☆ سب انسپکٹر اکرام کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اور چہرے پر حیرت!

☆ ایک بہت پرانی گرد آلود بوسیدہ فائل.....

☆ اس فائل میں ایسا کیا تھا؟؟

☆ یہ بات انسپکٹر جشید پارٹی کو معلوم ہوئی تو وہ دھک سے رہ گئے!!

☆ فائل ان کیلئے نہ صرف ایک چیلنج تھی بلکہ ایک منہ چڑاتا ناکامی کا تحفہ!

☆ ایک انوکھی، پراسرار، عجیب و غریب اور دلچسپ تلاش۔

☆ انسپکٹر کامران مرزا پارٹی تفریح کا پروگرام بنا کر گھر سے روانہ.....

☆ حسب معمول وہ سیر و تفریح ان کیلئے گلے کا پھندا بن گئی۔

☆